

اسلام
میں
نیکاح کے قوانین

مولانا صدر الدین اصلاحی

اسلامک پبلیکیشنز (پرائیٹ)، لیڈز لاہور



AUSTRALIAN ISLAMIC LIBRARY

From darkness to light!

www.AustralianIslamicLibrary.org



Note: Ideas, views and opinions expressed in this book may or may not represent libraries point of view. None of the views can be attributed to library or its management without prior consultation and discussion with its management.

Share on and join us in seeking Sadaqa Jariyyah, InshaAllah

(جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں)

طابع: _____ رانا اللہ داد خاں، میننگ ڈارکٹر
 ناشر: _____ اسلامک پبلیکیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
 ۱۳۱ اسی شاہ عالم مارکیٹ، لاہور
 مطبع: _____ سعادت آرٹ پریس، لاہور
 اشاعت:

۱۱۰۰	مئی ۱۹۹۰ء	۱
۱۱۰۰	نومبر ۱۹۹۳ء	۲
۱۱۰۰	مئی ۱۹۹۷ء	۳

فہرست مضامین

۶	عرض ناشر
۸	ارشاد باری تعالیٰ و فرمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
۹	مسئلہ نکاح اور اسلام
۹	نکاح کی مشروعیت
۱۳	معاملہ نکاح کی نوعیت
۱۵	مقاصد
۲۵	اہم اور بنیادی قوانین
۲۶	۱۔ جواز نکاح کے لئے ہم دینی کی شرط
۲۶	شرط کی قطعیت اور ہمہ گیری
	وجہ و مصالح
۴۳	۲۔ اہل کتاب کی عورتوں سے جواز نکاح کا استثناء
۴۸	۳۔ عورتوں کے معاملہ نکاح میں سرپرستوں کا حق ولایت
۵۵	۴۔ نابالغوں کا نکاح
۵۵	نکاح کی عام عمر
۵۶	نابالغوں کے نکاح کی اجازت
۵۹	مصلح
۶۱	نکاح کے انعقاد کی عملی شکل

- ۶۳ بلوغ کے بعد بسخ نکاح کا اختیار
- ۶۶ ۵۔ کفائت (برابری)
- ۶۶ مفہوم اور مقصد
- ۶۸ وہ امور جن میں کفائت مطلوب ہے
- ۷۵ کفائت جواز نکاح کی لازمی شرط نہیں
- ۷۸ مرد کے لئے کفائت کوئی مسئلہ نہیں
- ۷۸ ۶۔ مہندر
- ۷۸ شرعی اہمیت
- ۷۲ حیثیت اور مقاصد
- ۸۵ ۷۔ اعلان اور شہادت
- ۸۹ ایک تقابلی جائزہ
- ۸۹ کامن سول کوڈ کے چیلنج کا تقاضا
- ۹۰ اختلاف کے بنیادی نکات
- ۹۳ اسلامی قانون نکاح کے اصول و مقاصد
- ۹۵ سول کوڈ کے اصول و مقاصد
- ۱۰۳ تجربات کی گواہی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

تعارف

اس مختصر سی قلمی کاوش کے ذریعہ نکاح کے اسلامی قوانین کا تعارف کرائے اور یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ از روئے حقیقت یہ ایک بہترین قانون ہے، اور اس کے اندر حقیقت پسندی، مصلحت شناسی، دور بینی، حکمت و احتیاط فکری توازن اور تعمیری مزاج کی وہ ساری خوبیاں موجود ہیں جو ایک صاف ستھرے، خیر پسند حق شناس اور مہذب معاشرے کی تشکیل کی ضمانت دے سکتی ہیں۔ اس کے بعد انشاء اللہ طلاق، تعدد ازدواج اور وراثت کے موضوعات پر بھی کتابچے پیش کیے جائیں گے، جن پر ایک مدت تک کام ہو بھی چکا ہے۔ اللہ جل شانہ سے دعا ہے کہ اس کام کی تکمیل کے لیے فرصت بھی میسر ہو اور صحت و توانائی بھی اور ساتھ ہی وہ مقصد بھی پورا ہو جس کے لیے کاوش کی جا رہی ہے۔

صدر الدین اصلاحی

۲۶ اپریل ۱۹۷۸ء

عرض ناشر

مولانا صدر الدین اصلاحی بھارت کے ایک ممتاز عالم دین اور اہل فکر و قلم ہیں۔ اسلامک پبلیکیشنز اس سے قبل بھی آپ کی متعدد کتابیں شائع کر چکا ہے۔ اسلام میں نکاح کے قوانین و ضوابط پر الگ کوئی جامع کتاب موجود نہیں تھی۔ مولانا صدر الدین اصلاحی صاحب نے یہ کتاب مرتب کر کے بڑی حد تک اس غلاء کو پر کر دیا ہے اس تحریر کے محرک درحقیقت بھارت کے وہ مخصوص حالات ہیں جن میں مسلمانوں کے الگ دینی اور معاشرتی تشخص کو ختم کرنے کے لیے کامن سول کوڈ کے نام سے نکاح و طلاق کے ایسے قوانین نافذ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ اسلامی شریعت ————— کی بالادستی مسلمانوں کے ذاتی اور شخصی زندگی میں بھی عملاً ختم ہو جائے اور انہیں ایک متحدہ ہندوستانی قوم میں مدغم کرنا آسان ہو جائے۔

پاکستان میں بالخصوص اور عالم اسلام میں بالعموم لوگوں کو یہ اندازہ نہیں ہے کہ بھارت میں تیرہ پودہ کروڑ مسلمانوں کو کس ہوشیاری کے ساتھ بدمذہب ہندوستانی قومیت کی اسٹریٹجی اسلام سے بیگانہ اور اسلامی

تہذیب و تشخص سے محروم کرنے کے ایک سوچے سمجھے منصوبے پر
 عملدرآمد ہو رہا ہے۔ کامن سول کوڈ اسی مہم کا ایک اہم جزو ہے۔
 نکاح کے اسلامی قوانین کی بحث کے آخر میں فاضل مصنف نے
 اس کامن سول کوڈ اور اسلام کے قوانین نکاح کے فرق اور اس کے
 دور رس اثرات کا ایک مختصر لیکن جامع جائزہ پیش کیا ہے جسے ہم نے
 مسلمانان عالم کے علم و اطلاع کے لیے جوں کا توں اس میں برقرار رہنے
 دیا ہے تاکہ ہمارے قارئین کو بھی بجا رت میں مسلمانوں کی معاشرت کو
 شدھی کرنے کے تشویشناک منصوبے سے آگاہی حاصل ہو سکے۔

ارشاد باری تعالیٰ

وَأَنْكِحُوا الْأَيَامَىٰ مِنْكُمْ وَالصَّالِحِينَ مِنْ
عِبَادِكُمْ وَإِمَائِكُمْ۔

اپنے درمیان ایسے لوگوں کے نکاح کر دو جو مجرد ہوں نیز
اپنے غلاموں اور بیواؤں میں بھی جو نکاح کے لائق ہوں ان کے
نکاح کر دو۔

فرمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

يَا مَعْشَرَ الشَّبَابِ مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمُ الْبَاءَةَ
فَلْيَتَزَوَّجْ فَإِنَّهُ أَغْنَىٰ لِلْبَصْرِ وَآخَسَنِ لِلْفَرْجِ۔
اے نوجوانوں! تم میں سے جو بھی نکاح کرنے کی مالی
استطاعت رکھتا ہو اسے نکاح کر لینا چاہیے کہ نکاح نگاہوں
کو پست اور شرم گاہوں کو محفوظ رکھنے کا سب سے بہتر
اور موثر ذریعہ ہے۔

مسئلہ نکاح اور اسلام

نکاح کی مشروعیت

نکاح کے بارے میں اسلام کے نقطہ نظر اور اس کے قوانین کا مطالعہ شروع کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ان کا فکری اور مقصدی پس منظر سمجھ لیا جائے۔ ورنہ ان کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ لگا سنا بہت مشکل ہوگا۔

دین اور دین داری کے اسلامی تصور کی رو سے سچی اور مکمل خدا پرستی کی راہ دنیا اور دنیوی علائق سے کترا کر نہیں، بلکہ ان کے ٹھیک بیچ سے ہو کر گزرتی ہے۔ تجرد، رہبانیت اور ترک دنیا کو اس نے عبادت اور خدا پرستی کا بگڑا ہوا تصور قرار دیا ہے، جسے اپنے حکیم و علیم پروردگار کی دکھائی ہوئی راہِ راست سے ہٹ جانے کے باعث انسانی ذہن خود تراشتا رہا ہے۔ اے اللہ تعالیٰ کی پسند، اور اس کی تعلیمات کی سند کبھی حاصل نہیں رہی ہے اس کے بخلاف اس کی صرف پسند ہی نہیں، اس کی ہدایت اور تاکید بھی ہمیشہ یہی رہی ہے کہ انسان اس دنیا کا معمار بنے، اور اس غرض کے لئے اپنے اندر کی ساری قوتوں کو استعمال میں لائے۔ کیونکہ اسے جو بھی قوتیں اور صلاحیتیں عطا کی گئی ہیں وہ سب کی سب اس کے پیدائشی فرض منصبی کی انجام دہی کے لئے

ہی عطا کی گئی ہیں۔ ان میں کی ہر قوت، خواہ وہ روحانی قوت ہو خواہ مادی، فکری قوت ہو خواہ عملی، انسانیت کے مطلوبہ ارتقاء اور دنیا کی مطلوبہ تعمیر کے لئے بہر حال ایک کارآمد قوت ہے۔ اس لئے کسی بھی قوت کو کھل ڈالنا یا اُسے معطل بنائے رکھنا، حتیٰ کہ اسے بیکار اور فضول سمجھنا بھی مثلے خداوندی کے خلاف اور جہل و گمراہی کا رویہ ہے، کسی جہت سے بھی رضائے الہی کے مطابق اور علم و حق کا رویہ نہیں ہے۔ رضائے الہی کے مطابق اور علم و حق کا رویہ صرف یہ ہے کہ ظاہر اور باطن، جسم اور روح کی ہر قوت کو ایک با مقصد عطیہ خداوندی سمجھا جائے، اس سے بہر حال کام لیا جائے، اور اسے صحیح رخ پر اور صحیح حدود کے اندر پوری طرح کام کرنے کا موقع دیا جائے۔

جنسی قوت بھی انسان کی ایک پیدائشی قوت ہے، اور اس کی بھی حیثیت، قدرتی طور پر، وہی ہے جو دوسری تمام قوتوں کی ہے، یعنی وہ بھی ایک ایسی شے ہے جسے خدائے حکیم و علیم نے ایک خاص ضرورت کے تحت اور ایک خاص مقصد سے پیدا کیا ہے۔ اس لئے وہ یہ ہرگز پسند نہیں کر سکتا کہ اُسے نفرت کی نگاہ سے دیکھا جائے، اس کے مطالبے کو پاکیزگی نفس کے لئے خطرہ سمجھا جائے اور اُس کی موت کو روحانیت کی زندگی کی شرط لازم ٹھیرایا جائے۔ اسکے برعکس اس کی پسندیدگی اس بات میں ہے کہ اُسے زندہ و کار فرما رکھا جائے۔ اس لئے اسلام نے، جو بجا طور پر اپنے کو دین فطرت کہتا ہے، نکاح کو جو اس جنسی قوت کے تقاضوں کی تکمیل کا ایک ہی صحیح طریقہ ہے، نہ صرف پسند کیا ہے بلکہ اس کی ترغیب اور تلقین فرمائی ہے، اور اس سے روگردانی کو قابل ملامت ٹھیرایا ہے

اس سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات پر ایک نظر ڈال لیں بالکل کافی ہو گا۔

النِّكَاحُ مِنْ سُنَّتِي فَمَنْ لَمْ يَعْمَلْ بِسُنَّتِي فَلَيْسَ مِنِّي۔ (ابن ماجہ، ابواب النکاح ص ۱۳۲)

”نکاح میری ایک سنت ہے۔ پس جو کوئی میری سنت پر عمل نہ کرے گا وہ میرا نہ ہو گا۔“

..... وَآتَزَّوْجُ الْيَسَاءِ فَمَنْ رَاَ غَبَ عَنْ سُنَّتِي فَلَيْسَ مِنِّي (بخاری، جلد دوم، کتاب النکاح ص ۴۵)

”..... اور میں عورتوں سے نکاح (بھی) کرتا ہوں، پس جو کوئی یہ (اس) طریقے سے روگردانی اختیار کرے گا وہ میرا نہ رہے گا۔“

لَا صَرْدَ رَأًةً فِي الْإِسْلَامِ۔ (ابوداؤد، جلد اول، کتاب النکاح ص ۲۲۲)

”اسلام میں تجرد کی کوئی گنجائش نہیں۔“

لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ۔ (نیل الاوطار، جلد ۴، کتاب النکاح)

”اسلام میں کسی طرح کی رہبانیت نہیں۔“

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ان فرمودات سے واضح طور پر یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ نکاح، معروف معنوں میں ایک خالص دنیوی معاملہ ہونے کے باوجود اسلامی نظام شریعت کا جزو ہے، ایک مشروع فعل ہے، سنت رسول ہے، طریقہ انبیاء ہے۔ تجرد اور رہبانیت کی، دین خداوندی میں کوئی جگہ نہیں ہے اُسے

پسند کرنا اور نکاح کو قابلِ اجتناب سمجھنا راہِ راست سے کھلا ہوا انحراف ہے، اور ہادی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا رویہ اختیار کرنے والے کو 'اپنا' نہیں 'غیر' ٹھیرایا ہے۔ پس نکاح ایک ایسا عمل ہے جو سچے اسلام اور صیغہ ایمان سے راست ربط رکھتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا اس ربط کو پوری طرح کھول دیتا ہے:-

مَنْ آعْطَىٰ لِلَّهِ وَ مَنَعَهُ لِلَّهِ وَ أَحَبَّ لِلَّهِ وَ أَبْغَضَ
لِلَّهِ وَ أَتَمَّ لِلَّهِ فَقَدْ اسْتَكْمَلَ الْإِيمَانَ (المتدک للماکم، جلد
دوم ص ۱۶۴)

”جس نے اللہ کے لئے دیا اور اللہ ہی کے لئے روک رکھا، اللہ کے لئے محبت کی اور اللہ ہی کے لئے عداوت بھی رکھی، اور اللہ ہی کے لئے نکاح بھی کیا، اس نے اپنے ایمان کو مکمل کر دیا۔“

گویا پوری حقیقت یہ ہے کہ نکاح کمالِ ایمان اور کمالِ اسلام کے لوازم جیسا ہے۔

نکاح کے شرعاً مطلوب ٹھہرائے جانے، اور کمالِ ایمان و اسلام کے لوازم میں سے ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کے نزدیک تمدن اور اجتماعیت کا وجود اس زندگی کے لئے ضروری ہے جو انسان کو بسر کرنی چاہیے۔ زیادہ واضح لفظوں میں یہ کہ نوعِ انسانی کی تخلیق کی جو غایت ہے اور انسان کا جو حقیقی وظیفہ حیات ہے، اس کی تکمیل ایک متمدن اور منظم سماج کے بغیر ہو ہی نہیں سکتی۔ چونکہ نکاح، مسئلہ طور پر، تمدن و اجتماع کی بنیادی اینٹ ہے، اس لئے بالکل قدرتی بات

تھی کہ اسلام اسے شایانِ شانِ اہمیت دیتا، اور اپنے نظامِ شریعت کا لازمی جزو بناتا۔

معاملہ نکاح کی نوعیت

اسلام میں نکاح کے معاملے کی نوعیت نہ خالص دنیوی ہے نہ خالص دینی۔ اس پہلو سے، کہ وہ عاقل بالغ افراد کے آزادانہ معاہدہ یا ہی کا نام ہے، اور اس کی انجام دہی میں کسی مذہبی تقریب یا کسی مذہبی شخصیت کے واسطے کی ضرورت نہیں ہوتی، اسے ایک دنیوی معاملہ کہا جانا چاہیے۔ لیکن اس پہلو سے، کہ وہ ایک مطلوب و مشروع فعل ہے، سنتِ رسولؐ ہے، کمالِ ایمان و اسلام کے لوازم میں سے ہے، اس کا معاہدہ ایک شرعی معاہدہ ہوتا ہے، اس سے مادی مقاصد ہی نہیں دینی اور اخلاقی مصالح بھی مطلوب ہوتے ہیں اور شرعی حقوق و فرائض کی ایک طویل فہرست اس سے وابستہ ہوتی ہے، وہ ایک دینی معاملہ کھائی دینے لگتا اور اک گونہ شانِ تقدس کا حامل قرار پاتا ہے۔ علمائے اسلام کی نگاہ میں معاملہ نکاح کے یہ دونوں ہی پہلو تھے۔ اس لیے انہوں نے اسے بجا طور پر دنیوی اور دینی دونوں ہی نوعیت کا معاملہ قرار دیا۔ چنانچہ فقہاء نے اسے

لہ معاملہ نکاح کے یہی سارے پہلو ہیں۔ جن کے پیشِ نظر احناف نے نکاح کو فعلِ عبادت کہا ہے (فتح الباری جلد ۹ ص ۸۶) نیز حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ ”جب بندہ نکاح کر لیتا ہے تو وہ اپنا آدھا دین پورا کر لیتا ہے“ ۱ اِذَا شَرَّوْجَ الْعَبْدُ فَقَدْ اسْتَكْمَلَ بِصِنْفِ الدِّينِ (بیہقی بحوالہ مشکوٰۃ کتاب النکاح ص ۲۵۸)

معاملات اور عبادات دونوں ہی میں داخل کیا ہے۔ پس صرف یہ دیکھ کر، کہ نکاح کے وقت کسی مذہبی رسم کا ادا کیا جانا ضروری نہیں ہوتا، اسے ایک خالص دیوانی معاہدہ، یا ایک خالص دنیوی کارروائی، قرار دینا حقیقت ناشناسی کی بات ہے۔ اس بارے میں غلط فہمی غالباً اس بنا پر بھی ہوئی کہ نکاح کے نتیجے میں پیدا ہونے والے حقوق و فرائض کی انجام دہی کا معاملہ آخرت پر نہیں چھوڑا جاتا، بلکہ اسے ہر وقت عدالت کے ذریعہ نافذ کرایا جاسکتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ ازدواجی حقوق و فرائض کے باب میں امر واقعہ صرف اتنا ہی نہیں ہے، بلکہ کچھ اور بھی ہے، اور وہ یہ کہ یہ حقوق کسی دنیوی ادارے کے عطا کیے ہوئے نہیں ہوتے، بلکہ شریعت الہی کے مقرر کیے ہوئے اور اسی کے عطا کیے ہوئے ہیں، اور اگر ان کے بارے میں عدالت سے چارہ جوئی کی جاسکتی ہے تو اس کی بنیاد بھی یہی حقیقت ہوتی ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ امر واقعی کے اس پہلو کو، جو زیادہ اہم اور بنیادی ہے، نگاہ میں نہ رکھا جائے جس کے بعد نکاح کو ”خالص دیوانی معاہدہ، یا خالص دنیوی

۱۵ جیسا کہ برصغیر کی اعلیٰ عدالتوں اور پریوی کونسل کا، زمانہ دراز تک نقطہ نظر رہا ہے، اور جسٹس محمود جیسے صاحب نظر مسلمان قانون دان تک کا خیال تھا۔ (بحوالہ ”مجموعہ قوانین اسلام“ جلد اول ص ۵۵ مصنفہ تنزیل الرحمان)

۱۶ جیسا کہ جسٹس امیر علی نے خیال ظاہر کیا ہے۔ (”جامع الاحکام فی فقہ الاسلام“ جلد اول ص ۱۱، اردو ترجمہ ”پرسنل لائف دی محمدنس مصنفہ امیر علی۔)

کاروائی، سمجھنے کی کوئی معقول وجہ نہیں رہ سکتی۔

مقاصد

اسلام نے نکاح کے مقاصد حسب ذیل قرار دیئے ہیں :-
۱۔ نسل انسانی کی بقا و افزائش

سب سے پہلا اور بنیادی مقصد تو یہ ہے کہ نسل انسانی برابر باقی رہے اور بڑھتی رہے۔ کیونکہ اسلام نے، جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا، اس دنیا میں نوع انسانی کی پیدائش کا جو منصوبہ خداوندی بتایا ہے وہ اس وقت تک بروئے کار آہی نہیں سکتا جب تک کہ وہ یہاں پھولتی پھلتی نہ رہے۔ اس لئے خالق کائنات کا ستیادین ہونے کی بنا پر اسلام کے لئے جہاں یہ ضروری تھا کہ وہ نکاح کو ایک مشروع فعل ٹھیراتا، وہاں یہ بھی ضروری تھا کہ وہ نسل انسانی کی بقا و افزائش کو اس نکاح کا پہلا اور بنیادی مقصد قرار دیتا۔ قرآن حکیم نے نکاح کے اس بنیادی مقصد پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے :-

نِسَاؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَاَنْتُمْ وَاحِدٌ شَعْرٌ اَنْتُمْ
وَقَدْ مَوَّالٍ اَنْفُسِكُمْ۔ (بقرہ - ۲۲۳)

”تمہاری عورتیں تمہارے لئے کھیتی (کے مانند) ہیں۔ پس اپنی اس کھیتی میں جس طرح چاہو آؤ، اور اپنے مستقبل کی فکر کرو۔“

.....فَاَلَا نَبَاَشِرُوهُمْ وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ اللّٰهُ

لَكُمْ۔ (بقرہ - ۱۸۷)

”... سو اب ان سے (یعنی اپنی بیویوں سے) طوطاؤ، اور اس چیز

کے طالب بنو جو اللہ کے لئے تمہارے لئے مقدر کر رکھی ہے۔“

یہ دونوں آیتیں نکاح کے سب سے پہلے اور بنیادی مقصد کو بالکل واضح کر دیتی ہیں۔ عورت کو کھیتی فرما کر اس بات کو بالکل متعین کر دیا گیا کہ اس سے مقاربت کا اصل منشاء اولاد کا حصول ہے۔ کیونکہ کھیتی کا اصل مقصد پیداوار کا حصول ہی ہوتا ہے نہ کہ کچھ اور۔ اسی طرح قَدْ مُؤَا۔ (مستقبل کی فکر کرو) اَبْتَخُوا (طالب بنو) کے الفاظ استعمال کر کے، جو فعل امر ہیں، حقیقت کے اس پہلو کو بھی اُجاگر کر دیا گیا کہ اس کھیتی، سے ’پیداوار‘، (یعنی اولاد) کا حاصل کرنا ہی وہ اصل ضرورت ہے جس کے لئے اس (کھیتی) کا تہا رے واسطے قدرت کی طرف سے اہتمام کیا گیا ہے، اور اللہ تعالیٰ کا ’امر‘ (حکم) ہے کہ اس ’پیداوار کے‘ تم طالب بنو اور اس کے لئے کوشاں رہو۔

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

تَنَاجُحُوا وَتَنَاسَلُوا۔

”نکاح کرو اور نسل پیدا کرو۔“

نسل کی بقا و افزائش کا، نکاح کا اصل اور بنیادی مقصد ہونا اگرچہ کوئی دھکی چپی حقیقت نہ تھا اور عقل مام اس سے بالعموم ہمیشہ واقف ہی رہی ہے، لیکن اس کے باوجود قرآن حکیم نے یہی مناسب سمجھا کہ اسے صاف صاف بیان کر دے۔ اس سے اس کی اہمیت کا اظہار ہوتا ہے۔

۲۔ عفت کا تحفظ

نکاح کا دوسرا مقصد عفت — کردار کی عفت، نگاہ کی عفت اور خیال کی عفت — کا تحفظ ہے۔ عفت اور پاک دامنی کو اسلام کی نگاہ میں جو عظیم ترین اہمیت حاصل ہے اس کا اندازہ کرنے کے لئے صرف یہ جان لینا کافی ہے کہ بدکاری کے مجرم کے لئے جیسی سخت اور لرزہ خیز سزا مقرر کی گئی ہے اس کی اسلامی حدود تعزیرات میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ چنانچہ اس نے اسے انسانیت کا بنیادی شرف، اور دین و ایمان کا بنیادی تقاضا قرار دیا ہے، اور اس پر آئین کا آجانا اس کے لئے کسی حال میں بھی قابل برداشت نہیں — دوسری طرف یہ ایک کھل ہوئی حقیقت ہے کہ کم از کم تنانوے فی صد افراد اپنے آپ کو با عفت اسی وقت رکھ سکتے ہیں جب انہیں نکاح کی پناہ گاہ حاصل ہو۔ اس لئے اسلام نے بجا اور ناگزیر طور پر اس تحفظِ عفت کو بھی نکاح کا ایک اہم مقصد قرار دیا ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ :-

يَا مَعْشَرَ الشَّبَابِ مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمُ الْهَاءَ فَلْيَتَزَوَّجْ
فَإِنَّهُ أَغْضُ لِلْبَصَرِ وَأَحْصَنُ لِلْفَرْجِ الخ (بخاری و مسلم)

بحوالہ مشکوٰۃ ص ۲۶۵

”نوجوانو! تم میں سے جو بھی نکاح کرنے کی (مالی) استطاعت رکھتا ہو

اُسے نکاح کر لینا چاہیے، اس لئے کہ یہ نکاح گناہوں کو پست (اور پاک) اور

شرم گاہوں کو محفوظ رکھنے کی سب سے کارگر شکل ہے۔“

یعنی پاک کرداری اور پاک نگاہی کی کامیاب تدبیر، بالخصوص دورِ شباب

میں، صرف یہ ہے کہ آدمی ازدواجی زندگی اپنلے۔ ورنہ جبلت کے ہاتھوں شکست کھا جانا تقریباً یقینی ہے۔ اور چونکہ یہ بالکل ضروری ہے کہ اس شکست کی نوبت ہرگز نہ آنے دی جائے، اس لیے ارشاد مبارک کا منشاء یہ ہوا کہ نکاح ضرور کرنا چاہیے، تاکہ عفت کا دامن داغ دار ہو جانے سے محفوظ رہے۔

ایک اور ارشاد نبوی ہے:-

ثَلَاثَةٌ حَقٌّ عَلَى اللَّهِ عَوْنُهُمْ..... وَالنَّكَاحُ الَّذِي يُرِيدُ
الْعِفَّاتُ (ترمذی، جلد اول ص ۱۹۹)

دو تین قسم کے لوگوں کی مدد کرنا اللہ کے ذمہ ضروری ہے..... تیسرے وہ شخص

جس نے اپنے کو پاکدامن رکھنے کی خاطر نکاح کیا ہو،

معلوم ہوا کہ عفت اور پاک دامنی بجائے خود نکاح کا ایک بنیادی مقصد ہے، اور یہ اتنا اہم مقصد ہے کہ وہ آدمی کو اللہ تعالیٰ کی خصوصی نظرِ کرم کا سزاوار بنا دیتا ہے۔

اسلام کی نظر میں یہ مقصد (عفت) اتنا عزیز، اور اس کی یہ تدبیر (نکاح) اتنی اہم ہے کہ بعض حالات میں افراد سے آگے بڑھ کر معاشرے کو بھی اس نے اس کے اہتمام کا ذمہ دار بنا رکھا ہے۔ قرآن حکیم کی اس ہدایت پر نظر ڈالیے:-

وَأَنْكِحُوا الْأَيَّامَ مِنْكُمْ وَالصَّالِحِينَ مِنْ عِبَادِكُمْ
وَأَمْوَالِكُمْ (نور، ۳۲)

”اپنے اندر کے ان افراد کا، جو اپنا کوئی شریک زندگی نہ رکھتے ہوں، نیز

اپنے ان غلاموں اور لونڈیوں کا، جو (نکاح کے) لائق ہوں، نکاح کر دو۔“
 یہ آیت بالکل واضح طور سے معاشرے کے ذمہ دار لوگوں کو مخاطب کر
 رہی ہے، اور انہیں یہ ہدایت دے رہی ہے کہ تمہارے اندر کے جو افراد، قابل
 نکاح ہونے کے باوجود، کسی وجہ سے اپنا نکاح خود نہ کر پا رہے ہوں، ان کے
 نکاح کا انتظام تمہیں کر دینا چاہیے۔ یہ ہدایت جس غرض اور جس ضرورت سے
 دی گئی ہے اس کی وضاحت وہ سیاق کلام اور وہ سلسلہ بیان کرتا ہے جس
 کے تحت یہ آیت آئی ہے۔ سورہ کے شروع سے اس آیت تک، اور پھر اس
 کے بعد بھی دُور تک، بیان کیے جانے والے احکام، تمام کے تمام، ایک ہی
 جامع عنوان سے جڑے ہوئے ہیں، اور سب کا مدعا ایک ہی خاص مقصدِ عظیم
 کا حصول ہے۔ اور وہ یہ کہ ان تمام رخنوں کو بند کر دیا جائے۔ جن سے کسی طرح
 بھی جنسی بے راہ روی معاشرے میں راہ پا سکتی ہو۔ قابل نکاح لوگوں کا مجرد
 رہنا بھی چونکہ ایسا ہی ایک رخنہ تھا۔ اس لئے اسے بھی بند کرنا ضروری تھا
 زیر بحث آیت میں دی جانے والی ہدایت اسی مقصد کی خاطر دی گئی ہے۔ دوسرے
 لفظوں میں اس ہدایت کی غایت بھی یہی ہے کہ معاشرہ اخلاقی گندگی سے محفوظ رہے
 اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اخلاقی پاکیزگی کا تحفظ، اسلام کے
 نزدیک، نکاح کا کتنا اہم مقصد ہے، اور یہ کہ نکاح کے بغیر اس پاکیزگی کا
 حصول کتنا غیر متوقع، دشوار، بلکہ محال ہے۔

۳۔ دینی اور معاشرتی مصالح کی تکمیل

نکاح کا تیسرا مقصد، بعض حالات میں، کسی دینی ضرورت یا کسی معاشرتی مصلحت کی تکمیل بھی ہو سکتا ہے۔ انسانی زندگی آئے دن ایسے حالات سے دوچار ہوتی رہتی ہے جب کوئی اہم دینی یا معاشرتی مصلحت ایک اہم مسئلہ بن کر اس کے سامنے آکر پڑی ہوتی ہے، اور اس مسئلہ کا کامیاب عملی حل صرف یہ ہوتا ہے کہ آدمی نکاح کر لے۔

دینی مصالح کی خاطر نکاح کی سب سے نمایاں مثال خود آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا عمل ہے۔ اس بحث کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔ مختصراً اتنا جان لینا چاہیے کہ آپ نے جتنے نکاح بھی کیے، ان سب کے پیچھے کوئی نہ کوئی اہم دینی یا دعوتی یا اخلاقی مصلحت ضرور کار فرما تھی۔ ایک اہم و عظیم مصلحت، جو کم و بیش عموماً سبھی نکاحوں میں مد نظر رہی تھی، یہ تھی کہ ازواجِ مطہرات طبقہ نسواں تک شرعی احکام کے پہنچانے کا، خصوصاً ان احکام کے پہنچانے کا جو عورتوں کے مخصوص امور و مسائل سے تعلق رکھتے ہیں، ذریعہ بنیں۔

معاشرتی مصالح کی خاطر نکاح کیے جانے کی بہترین مثال قرآن مجید کی اس ہدایت میں موجود ہے:-

وَإِنْ خِفْتُمْ أَنْ لَا تَقْسِطُوا فِي الْيَتَامَىٰ فَانكِحُوا مَا
طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ مِمَّا مَشَرْتُمْ وَثَلَاثَ وَرُبَاعَ فَإِنْ خِفْتُمْ
أَنْ لَا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً..... (نساء - ۳)

”اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ (اپنے زیر سرپرستی) یتیموں کے معاملے میں عدل سے

کام نہ لے پاؤ گے تو عورتوں میں سے، جو تمہارے لئے خوش آئند ہوں، دو دو، تین تین، چار چار تک نکاح کر لو، لیکن اگر انہیں ڈر ہو کہ ان کے درمیان عدل نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی پر اکتفا کرو۔..... الخ“

ایک سے زائد نکاح کے مسئلے پر تفصیلی بحث کا یہاں موقع نہیں۔ اس جگہ صرف اس مصلحت اور غایت پر نظر ڈالیے جو اس آیت میں ایسے نکاحوں کی بیان کی گئی ہے۔ یہ مصلحت اور غایت معاشرے کے سب سے کمزور طبقے (یتیموں) کے مفادات اور حقوق کی حفاظت ہے۔ آیت کا کہنا یہ ہے کہ یتیموں کے مفادات کی حفاظت اور تکمیل بہر حال ہونی چاہیئے اور یہ ان کے سرپرستوں کی ذمہ داری ہے کہ ان کے حقوق اور مصالح تلف نہ ہونے پائیں، لیکن چونکہ یہ ایک مشکل ذمہ داری ہے جس سے عہدہ برآ نہ ہو سکنے کا اندیشہ نہیں ضرور لاحق ہو سکتا ہے، اسلئے مناسب یہ ہو گا کہ تم اپنے ان زیر سرپرستی یتیموں کی ماؤں سے شادی کر لو (اگر وہ محرمات میں سے نہ ہوں) بلکہ اگر غیر معمولی حالات کا تقاضا ہو تو اس اہم معاشرتی مسئلے کے حل کی خاطر تم ایسی دو، تین، حتیٰ کہ چار عورتوں تک کو نکاح میں لے لو۔ یہ ایک مؤثر اور بہتر تدبیر ہوگی۔ اُس بھاری ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو سکنے کی جو تم پر یتیموں کے حقوق اور مفادات کی حفاظت کے سلسلے میں عائد ہوتی ہے۔۔۔۔۔ یہ کس طرح مؤثر تدبیر ہوگی؟ یہ بات تھوڑے ہی غور و فکر کے بعد آسانی سمجھ لی جاسکتی یتیموں کی ماں کے ساتھ رشتہء نکاح قائم ہو جانے کے بعد ایک طرف تو خود مرد بھی ان یتیموں سے نفسیاتی طور پر زیادہ قرب اور یگانگی محسوس کرے گا جس کے نتیجے میں ان کی غور و پرداخت، ان کی تعلیم و تربیت ان کی ملکیتوں کی حفاظت،

غرض ان کے سبھی حقوق اور مفادات کے بارے میں اس کا ذہن زیادہ ہمدردانہ اور مشفقانہ رویہ اپنا سکے گا، دوسری طرف ان کی ماں بھی اس ذمہ داری کے ادا کرنے میں اس کی مددگار بلکہ نگران کی حیثیت سے ہر وقت اس کے ساتھ موجود رہے گی۔ اس طرح یہ رشتہ ان ناتوانوں کے حقوق اور مصالح کی حفاظت کی قابل اطمینان ضمانت بن جائے گا۔

انسانی احوال پر پھیل کر نظر ڈالیے تو اسی طرح کے کتنے ہی اور بھی ایسے معاشرتی مسائل پیدا ہوتے رہتے دکھائی دیں گے جن کا مناسب اور کامیاب حل نکاح کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔

ہم سکون قلب کا حصول اور ہم آہنگ خاندان کی تائیس

نکاح کا چوتھا مقصد قلب انسانی کے لئے سکون کا ایک۔ پرسترت اور مستقل ذریعہ فراہم کرنا اور اس کے نتیجے میں ایک ایسے خاندان کی بنیاد رکھنا ہے جس میں آپس کی دلی محبت ہو، جذباتی ہم آہنگی اور یک جہتی ہو۔ قرآن حکیم کا ارشاد ہے:-

هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَجَعَلَ مِنْهَا

زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ إِلَيْهَا۔ الخ (اعراف، ۱۸۹۰)

”وہی ہے جس نے تمہیں ایک ہی جان سے پیدا کیا اور اسی (کی جنس) سے

اس کا جوڑا (بھی) بنایا، تاکہ وہ اس کے پاس سکون پائے۔“

آیت کے آخری الفاظ ”لِيَسْكُنَ إِلَيْهَا“ سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ ازدواجی زندگی کا مقصد صرف مرد کے لئے سکون خاطر کا سامان فراہم کرنا ہے، عورت کے سکون خاطر کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ ایسا خیال کرنا حقیقت

ناشناسی کی بات ہوگی۔ کیونکہ عملاً یہ ممکن ہی نہیں کہ عورت تو سکون خاطر سے محروم ہو مگر مرد اس سے پوری طرح شاد کام ہو۔ چنانچہ ایک اور مقام پر ازدواجی زندگی کی اس غایت کو بیان کرتے ہوئے جو کچھ فرمایا گیا ہے۔ اس سے اس خیال کی صاف تردید ہو جاتی ہے:-

وَمِنْ آيَاتِهَا أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا
لِتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً..... الخ

(روم، ۲۱)

”اور اللہ کی (حکمت کی) نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ بھی ہے کہ اس نے تمہارے لئے تمہاری ہی جنس کے جوڑے بنائے ہیں، تاکہ تم اُن سے سکون پاؤ، نیز (یہ کہ) اس نے تمہارے (جوڑوں کے) درمیان آپس کی محبت اور رحم دلی پیدا کر رکھی ہے“

”تمہارے (جوڑوں کے) درمیان آپس کی محبت اور رحم دلی پیدا کرنے“ کا مطلب واضح طور پر یہ ہے کہ شوہر اور بیوی دونوں ہی کے دلوں میں ایک دوسرے کی اُلفت اور شیفتگی ڈال دی گئی ہے۔ معلوم ہوا کہ ازدواجی رفاقت سے، دونوں ہی کا ایک دوسرے سے قلبی سکون پانا مطلوب ہے، نہ کہ صرف شوہر ہی کا۔

ان دونوں ہی آیتوں کے اندازِ بیان سے، بالخصوص ان کے الفاظِ مزوج اور ازدواج سے جس حقیقت کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ ازدواجی رشتہ کا مقصد زوجین کے لئے سکونِ خاطر کی فراہمی ہے، بلکہ اس

سے آگے بڑھ کر یہ بھی ہے کہ یہ رشتہ بجلئے خود 'مودت' اور رحمت کی بنیاد پر قائم ہو اور قائم رہے۔

ان چیزوں کو نکاح کا ایک اہم مقصود قرار دیئے جانے کی وجہ بالکل کھلی ہوئی ہے۔ ازدواجی زندگی کا سکون قلب سے محروم، اور باہمی مودت و رحمت سے خالی ہونا اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ یہ ایک بے جان اور نامراد رشتہ ہے ایسا رشتہ ایک طرف تو زوجین کے لئے مستقل عذابِ جان بنا رہے گا، دوسری طرف معاشرے کے حق میں بھی کسی خیر کا باعث نہ بن سکے گا۔ کیونکہ وہ ان ذمہ داریوں کو پورا کر سکنے کے قابل کبھی ہو ہی نہیں سکتا جو معاشرے کی صحیح تعمیر و ترقی کے سلسلے میں اس پر عائد ہوتی ہیں۔ اس لئے زوجین کے لئے سکونِ خاطر کا حصول، اور پھر اس کے فطری نتیجے کے طور پر ایک ہم آہنگ، یک جہت اور مودت و رحمت سے خاندان ان کی تاسیس، نکاح کا ایک ایسا عظیم مقصد ہے جو بجلئے خود تو ضروری ہے ہی، دوسرے مقاصدِ نکاح کے لئے بھی ضروری ہے۔ کیونکہ دوسرے مقاصد بھی اپنی مطلوبہ شکل میں اس وقت تک ہرگز پورے نہیں ہو سکتے جب تک کہ زوجین کو باہمی محبت اور الفت نے شیر و شکر نہ کر دیا ہو۔ اس لحاظ سے نکاح کا یہ مقصد اہم ہی نہیں، غیر معمولی حد تک اہم ہے۔

اہم اور بنیادی قوانین

نکاح کے مقاصد کو سمجھ لینے کے بعد آئیے۔ اب نکاح کے اسلامی قوانین کا مطالعہ کریں۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کوئی بھی قانون بجائے خود مقصود نہیں ہوا کرتا، بلکہ کسی مقصد کے حصول کا صرف ذریعہ ہوا کرتا ہے۔ اس لیے اس بارے میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ اسلام نے نکاح کے متعلق جو قوانین دیئے ہیں وہ دراصل ان مقاصد کی خاطر، اور ان کے حصول کے ناگزیر ذرائع کے بطور دیئے ہیں جنہیں وہ نکاح سے حاصل کرنا چاہتا ہے، اور جن کی وضاحت ابھی گزر چکی ہے۔ اسلامی قوانین نکاح کا مطالعہ کرتے وقت ان کے اس فکری پس منظر کا سامنے رہنا بہت ضروری ہے۔

کسی مجموعہ قوانین میں اصل اہمیت ان کی بنیادی دفعات ہی کو حاصل ہو کرتی ہے۔ انہی سے اس پورے مجموعے کے مدعا، مزاج اور حسن و قبح، سب کچھ کا پورا اندازہ کر لیا جاسکتا ہے۔ بلکہ یوں کہیے کہ صحیح اندازہ فی الواقع انہی کے گہرے مطالعے اور جائزے پر موقوف ہوا کرتا ہے۔ اس لیے ہم یہاں صرف انہی قوانین کو بحث و گفتگو کے لیے منتخب کریں گے۔ جو اسلامی شریعت میں نکاح کے اصول اور بنیادی احکام کی حیثیت رکھتے ہیں، اور وہ یہ ہیں:-

- ۱۔ جوازِ نکاح کے لئے ہم دینی ضروری ہے۔
 - ۲۔ اہل کتاب عورت سے مسلمان مرد کے نکاح کی اجازت ہے۔
 - ۳۔ بالغ لڑکیوں اور عورتوں کے نکاح کے معاملے میں ان کے شرعی ولی (سرپرست) کی رائے کو بھی اک گونہ دخل حاصل ہے۔
 - ۴۔ نابالغوں کے بھی نکاح کی اجازت ہے۔
 - ۵۔ مرد کو عورت کا کفو (ہم سر) ہونا چاہیئے۔
 - ۶۔ عورت کو مناسب مہر ملنا ضروری ہے۔
 - ۷۔ نکاح کے منعقد ہونے کے لئے شہادت اور اعلان ضروری ہے۔
- ان بنیادی احکام میں سے ہر حکم کے سلسلے کی ضروری تفصیل حسب ذیل ہے :-

۱۔ جوازِ نکاح کے لئے ہم دینی کی شرط

شرط کی قطعیت اور ہمہ گیری

نکاح کے قانونی (شرعی) طور پر صحیح اور جائز ہونے کی سب سے مقدم شرطوں میں سے ایک اہم ترین شرط یہ ہے کہ مرد اور عورت دونوں مسلمان ہوں۔ قرآن کریم کا صاف و صریح حکم ہے :-

لے اس اصولی اور کلی حکم میں صرف ایک استثناء ہے اور وہ یہ کہ "اہل کتاب کی عورتوں سے مسلمان مرد کا نکاح ہو سکتا ہے۔ اس مسئلہ پر مفصل گفتگو آگے آرہی ہے۔

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ حَتَّىٰ يُؤْمِنَ..... وَلَا
تَنْكِحُوا الْمُشْرِكِينَ حَتَّىٰ يُؤْمِنُوا۔ (بقرہ، ۲۲۱)

”(مسلمانوں!) مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو تا وقتیکہ وہ ایمان نہ
لائیں..... اور اپنی عورتوں کو مشرک مردوں کے نکاح میں نہ دو جب تک کہ وہ
ایمان نہ لائیں۔“

ایک اور موقع پر فرمایا گیا ہے :-

..... لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّونَ لَهُنَّ..... وَلَا
تُمْسِكُوا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ۔ (متحدہ، ۱۰)

”..... نہ یہ (مومن) عورتیں ان (کافر) مردوں کے لئے حلال ہیں نہ وہ
(کافر) مرد ان (مومن) عورتوں کے لئے..... اور (اے مسلمانو!) کافر
عورتوں کے ناموس اپنے قبضہ میں نہ رکھو۔“

یہ ارشادات خداوندی اس امر کا کھلا ہوا اعلان ہے کہ نکاح کے جائز ہونے
کے لئے ہم دینی ضروری ہے، کسی مسلمان مرد کا نکاح کسی مشرک یا کافر عورت
سے، اور کسی مسلمان عورت کا نکاح کسی مشرک یا کافر مرد سے قطعاً ممنوع ہے۔
اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ اگر ایسا کوئی نکاح کر ڈالا گیا تو اس کا کوئی اعتبار نہ ہوگا
وہ سرے سے منعقد ہی نہ ہوگا، اور فقہ کی اصطلاح میں ”باطل“ ہوگا۔ ایسے نام

لے بعض علماء نے ایسے نکاح کو ”باطل“ نہیں بلکہ صرف ”فاسد“ کہا ہے۔ لیکن نہ خود یہ جہالت
ہی علم و فقہ کی دنیا میں کوئی نمایاں مقام رکھتے ہیں، نہ ان کی یہ رائے ہی اہل علم (بقیہ ص ۲۸ پر)

نہاد نکاح کے نتیجے میں نہ عورت مرد کے لئے حلال ہوگی، نہ ان سے پیدا ہونے والی اولاد جائز اور صحیح النسب اولاد تسلیم کی جائے گی، نہ وہ ایک دوسرے کے وارث ہو سکیں گے۔

ان آیتوں میں ”مشرک عورتوں“ اور ”مشرک مردوں“ نیز ”کافر مردوں“ اور ”کافر عورتوں“ کے الفاظ سے یہ ہرگز نہ سمجھنا چاہیے کہ اگر کوئی غیر مسلم ایسا ہو جس پر ”مشرک“ یا ”کافر“ کی اصطلاح کا اطلاق کسی وجہ سے نہ ہوتا ہو تو وہ اس حکم ممانعت سے باہر ہوگا اور اس سے مسلمان کا نکاح جائز رہے گا۔ نہیں، اس حکم

(بقیہ ص ۲۷ کا) ماہرین شریعت کی مجاہد میں کوئی وزن پاسکی ہے۔ غالباً اسی رائے کا سہارا لے کر جسٹس امیر علی نے بھی ایسے نکاح کو صرف فاسد قرار دیا ہے۔ یعنی یہ ایسا نکاح ہوگا جسے فی الفور فسخ کر دیا جانا تو یقیناً ضروری ہوگا۔ اور اس کا دینی حیثیت سے گناہ کبیرہ ہونا بھی قطعی ہوگا۔ لیکن وہ ”باطل“ یعنی آپ سے آپ کا عدم نہ ٹھہرے گا۔ موصوف کے خیال میں کفر اور شرک، نکاح کے صرف ایسے موانع ہیں جو ”فی نفہ اور باعتبار نتیجہ اضافی ہیں، یعنی نکاح کو بالکل کالعدم نہیں کر دیتے (جامع الاحکام فی فقہ الاسلام جلد اول ص ۱۴۱، اردو ترجمہ ”پرنسپل لاء آف دی محمدنس“، مصنف امیر علی) اور ملا کا بھی یہی خیال ہے۔ نیز ولسن نے بھی یہی رائے ظاہر کی ہے۔ (اے ڈائجسٹ آف اینگلو محمدن لاء ص ۲۶) جب کہ نواب سر عبد الرحمن نے ایسے نکاح کو ”باطل“ ہی قرار دیا ہے (انسٹی ٹیوٹس آف مسلمانز لا۔ آرٹیکل ۱۳۴ ص ۴۲ بحوالہ ”مجموعہ قوانین اسلام“ جلد اول ص ۱۴۵، مصنف تنزیل الرحمن) قرآن حکیم کی مذکورہ آیات کا جو شخص بھی گہری نظر سے (بقیہ ص ۲۹ پر)

میں وہ سبھی لوگ داخل ہیں جو دائرۃ اسلام سے علیحدہ ہوں۔ کیونکہ یہ ممانعت جس وجہ سے کی گئی ہے وہ تمام غیر مسلموں کے ضمن میں بالکل یکساں طور پر موجود پائی جاتی ہے، خواہ ان کا تعلق کسی بھی اصطلاحی نام رکھنے والے غیر مسلم گروہ یا فرقے یا ملت سے ہو۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ جوازِ نکاح کے معاملے میں ان کے درمیان کوئی فرق کیا جائے۔ جب ممانعت کی وجہ اور اس کی غایت ہر جگہ یکساں طور پر موجود ہے تو اس ممانعت کا حکم بھی سب پر یکساں طور سے عائد ہونا چاہیے چنانچہ مذکورہ بالا آیتوں کے الفاظ ”حَتّٰی یُؤْمِنَ“ (تا وقتیکہ وہ عورتیں ایمان نہ لائیں) اور ”حَتّٰی یُؤْمِنُوْا“ (جب تک کہ وہ لوگ ایمان نہ لائیں) اس بات کا صاف اعلان کر رہے ہیں کہ کسی بھی منکرِ اسلام سے ازدواجی رشتہ قائم کیا جانا اسی وقت جائز ہو سکتا ہے جب وہ اسلام پر ایمان لا چکا ہو۔ گویا دوسرے لفظوں میں بات یہ ہوئی کہ کسی بھی طرح کے غیر مسلم سے اس وقت تک نکاح کا رشتہ قائم نہیں کیا جاسکتا جب تک کہ وہ اسلام کے دائرے میں داخل نہ ہو چکا ہو۔ جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ پھر ان آیتوں میں نکاح کی ممانعت کرنے کے سلسلے میں مخصوص طور پر ”مشرکین“ اور ”مشرکات“، نیز ”کفار“ اور ”کوافر“ کے اصطلاحی الفاظ کیوں لائے گئے ہیں، کوئی عام اور جامع لفظ لاکر سارے ہی غیر مسلموں کی طرف اس ممانعت کی نسبت کیوں نہیں واضح کر دی گئی؟ تو اس

(بقیہ صفحہ ۳۰ کا) جائزہ لے گا اور ان کے مدعا تک پہنچنے کی کوشش کرے گا وہ امیر علی وغیرہ کی رائے کو حقیقت سے فرار یا ذہن کی نارسانی ہی قرار دے گا۔

سوال کا جواب یہ ہے۔ کہ ان آیتوں کے نزول کے وقت بالفعل یہ اصطلاحی مشرکین اور کفار ہی سامنے تھے اور انہی کے ساتھ اردو واجی رشتے قائم کرنے یا قائم رکھنے کا مسئلہ زیر بحث تھا، اس لئے بالکل فطری بات تھی کہ ممانعت کی ہدایت دیتے ہوئے مخصوص طور پر صرف انہی کا نام لیا جاتا، اگرچہ وہ بجائے خود بالکل عام اور ایک اصولی ہدایت تھی۔

جس طرح کسی غیر مسلم سے مسلمان کا نکاح نہیں ہو سکتا اور کیا جائے تو وہ باطل اور کالعدم ٹھیرتا ہے، اسی طرح اگر کسی غیر مسلم جوڑے میں سے کوئی ایک اسلام قبول کر لیتا ہے اور دوسرا اپنے آبائی دین پر قائم رہ جاتا ہے تو جیسا کہ اصول کا کھلا ہوا تقاضا ہے، اب ان دونوں کا نکاح برقرار نہ رہ سکے گا۔ بعض حالات میں یا تو وہ فوراً آپ سے آپ ختم ہو جائے گا۔ یا قاضی اُسے کالعدم ٹھیرا دے گا۔ اور بعض حالات میں عورت کی عدت پوری ہونے تک باقی رہے گا۔ اس دوران اگر دوسرا فریق بھی اسلام قبول کر لیتا ہے۔ تب تو وہ برقرار رہے گا۔

۱۔ اس مام حکم میں صرف ایک استثناء ہے، اور وہ یہ کہ اگر اسلام شوہر نے قبول کیا ہو اور عورت نے قبول تو نہ کیا ہو مگر وہ کتابیہ (یعنی عیسائی یا یہودی ہوا) ایسی شکل میں باتفاق ان کے ان کا نکاح بدستور برقرار ہے گا۔ یہ اس لئے کہ کتابیہ سے مسلمان مرد کا نکاح جائز ہے۔

۲۔ مثلاً جب اسلام قبول کر لینے والا فرد دار الکفر سے ہجرت کر کے دارالاسلام میں آجائے۔

۳۔ مثلاً جب دوسرا فریق (جو اسلام نہیں لایا ہے) اپنے سامنے اسلام کے پیش کیے جانے کے

بعد بھی اسے قبول کرنے سے انکار کر دے۔

جائے گا۔ ورنہ از خود ختم ہو جائے گا۔

کسی غیر مسلم جوڑے میں سے ایک فریق کے مسلمان ہو جانے کی شکل میں ان کے رشتہ نکاح کے منقطع ہو جانے کی وجہ یہ ہے کہ دینی اختلافات کی وہی دوری اب یہاں بھی پیدا ہو چکی ہوگی۔ جس کو قرآن حکیم نے ازدواجی رشتے کے بارے میں ناقابل عبور خلیج قرار دیا ہے۔ چنانچہ زمانہ نبوت میں ایسی صورت حال برابر پیش آرہی تھی کہ زوجین میں سے ایک اسلام کے دائرے میں داخل ہو گیا اور دوسرا بدستور اپنے آبائی مذہب ہی پر جم رہا۔ مکی دور چونکہ شریعت کے تفصیلی احکام کے نازل ہونے کا دور نہ تھا اس لیے اس وقت تک تو اس صورت حال کو خاموشی کے ساتھ انگیز کیا جاتا رہا، مگر مدنی دور شروع ہونے کے بعد، جب احکام شرع نازل ہونے لگے تو جہاں ایک طرف کفار اور مشرکین سے نکاح کا رشتہ قائم کرنے کی قطعی ممانعت کر دی گئی، جیسا کہ اوپر واضح کیا جا چکا ہے، وہیں دوسری طرف اس طرح کے پہلے سے موجود چلے آنے والے رشتوں کے بارے میں بھی اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان صادر ہوا کہ:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا جَاءَكُمُ الْمُؤْمِنَاتُ مِنْ أَهْلِ الْكُفْرِ
فَاُمْتَحِنُوهُنَّ ۚ إِنَّهُنَّ لَا يَحِلُّ لَكُنَّ حَتَّىٰ تَخْرُجُوا مِنْهُنَّ ۚ فَإِنْ عَلِمْتُمُوهُنَّ

۱۔ مثلاً جب زوجین میں سے صرف ایک فرد کے اسلام قبول کرنے کا یہ واقعہ دار الکفر میں پیش آیا ہو۔ (یہ ساری مثالیں حنفی فقہ کی ہیں، دوسری فقہوں کی مثالیں اور دیگر تفصیلات معلوم کرنے کے لیے فقہ کی کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہیے)۔

مُؤْمِنَاتٍ فَلَا يَرْجِعُوهُنَّ إِلَى الْكُفَّارِ لَا هُنَّ حِلٌّ
لَهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّونَ لَهُنَّ وَاثُوهُمْ مَا أَنْفَقُوا وَلَا
جُنَاحَ عَلَيْكُمْ أَنْ تَنْكِحُوهُنَّ إِذَا آتَيْتُمُوهُنَّ أَجُورَهُنَّ
وَلَا تُنْكِحُوا بَعْضَ الْكَوَافِرِ وَأَسْأَلُوا مَا أَنْفَقْتُمْ
وَلَيْسَ لَكُمْ أَنْفَقُوا ذَا لَكُمْ حُكْمُ اللَّهِ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ وَاللَّهُ
عَلِيمٌ حَكِيمٌ (ممتز، ۱۰)

”اے ایمان والو جب مومن عورتیں ہجرت کر کے تمہارے پاس آجائیں
تو ان (کے مومن ہونے) کی جانچ کر لو۔ اللہ انکے ایمان کی بابت بخوبی علم
رکھنے والا ہے۔ پس اگر تمہیں معلوم ہو کہ وہ (فی الواقع) مومن ہیں تو پھر
انہیں کافروں کے پاس واپس نہ لوٹاؤ (کیونکہ) نہ یہ عورتیں ان کافروں کے
لئے حلال ہیں نہ یہ کافران عورتوں کے لئے حلال۔ اور انہوں نے (اپنی ان
مسلمان ہو جانے والی عورتوں پر مہر میں) جو کچھ خرچ کیا ہو وہ انہیں (واپس دے
دو، اور ان عورتوں سے نکاح کر لینے میں تم پر کوئی گناہ نہیں جب کہ ان کے
مہر انہیں دے دو۔ اور (اسی طرح اب) تم (خود بھی) اپنی کافر عورتوں کو
اپنے نکاح میں نہ روکے رکھو۔ تم نے (بلور مہران پر) جو کچھ خرچ کیا تھا اسے
واپس مانگ لو۔ اور جو کچھ کافروں نے (اپنی مسلمان ہو جانے والی
بیویوں پر) خرچ کیا تھا۔ اُسے وہ واپس طلب کر لیں، یہ اللہ کا
فیصلہ ہے، وہ تمہارے درمیان فیصلہ کر رہا ہے۔ اور اللہ علیم
و حکیم ہے۔“

یہ ارشاد الہی پوری مراحت سے بتا رہا ہے کہ اگر کسی غیر مسلم جوڑے میں سے کوئی ایک فرد اسلام قبول کر لیتا ہے اور دوسرا بدستور اپنے قدیم مذہب ہی پر قائم رہتا ہے۔ تو نہ صرف یہ کہ ان کا رشتہ 'نکاح' اب جائز اور قانونی نہیں رہ جائے گا۔ بلکہ اگر دین کے اس اختلاف کے ساتھ ساتھ 'دار' کا اختلاف بھی واقع ہو گیا ہو، یعنی اسلام قبول کر لینے والا فرد دارالکفر سے ہجرت کر کے دارالسلام کی شہریت اختیار کر چکا ہو اور دوسرا فریق اپنی قدیم شہریت ہی برقرار رکھے ہوئے ہو، تو ان دونوں کا نکاح خود بخود کالعدم ہو رہے گا۔ اسے ختم کرنے کے لئے کسی طلاق یا عدالتی حکم کی بھی کوئی ضرورت نہ ہوگی۔ اب مرد اور عورت دونوں قانونی طور پر اس بات کے لئے آزاد ہوں گے کہ جہاں چاہیں اپنا دوسرا نکاح کر لیں۔

پھر یہی حکم اس وقت بھی ہوگا۔ جب کسی مسلم جوڑے میں سے ایک نے ارتداد کا راستہ اختیار کر لیا ہو۔ کیونکہ اس صورت میں بھی ان دونوں کے درمیان

۱۔ اگرچہ اصول اور قانون کا ظاہری تعاضل ہی ہے کہ اس حکم کا ہر حال میں اطلاق ہو، مگر علمائے متاخرین نے جب دیکھا کہ بعض مجبور اور بے بس عورتیں اپنے ظالم شوہروں سے نجات کی کوئی مناسب راہ نہ پا کر محض اس لئے مرتد ہو جایا کرتی ہیں کہ اس طرح ان کی قیدِ نکاح سے آپ سے آپ محو خلاصی ہو جائے گی، تو انہوں نے بالکل بجا طور پر ایسے ارتداد کی شکل میں نکاح کے نسخ نہ ہونے کا فتویٰ دے دیا۔ بلخ کے حنفی علماء کا یہی فتویٰ ہے اور مالکیہ کا بھی یہی مسلک ہے۔ (کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۲ ص ۲۴۴)

اسلام اور غیر اسلام کے اختلاف کی خلیج حائل ہو چکی ہوگی۔ اس لئے اب ان کا بھی نکاح اسی طرح برقرار نہ رہ سکے گا۔ جس طرح کسی غیر مسلم جوڑے میں سے ایک فرد کے مسلمان ہو جانے کی شکل میں اس کا نکاح برقرار نہیں رہ جاتا بلکہ فوراً یا عورت کی مدت گزر جاتے ہی فسخ ہو جائے گا۔

غرض اسلامی شریعت میں ازدواجی رشتے کے جائز اور قانونی تسلیم کیے جانے کے لئے ہم دینی ایک مستقل اور دائمی شرط ہے۔ اس رشتے کے قائم ہونے کے وقت بھی اس شرط کا پایا جانا ضروری ہے اور اس کے قائم و برقرار رہنے کے لئے بھی ضروری ہے۔

وجوہ و مصالح

جواز نکاح کے لئے ہم دینی کی یہ لازمی شرط جن وجوہ کی بنا پر عائد کی گئی ہے وہ حسب ذیل ہیں:-

۱۔ ایمان کی حفاظت

سب سے اہم، بنیادی، نمایاں اور فیصلہ کن وجہ تو وہ ہے جسے خود قرآن

لے اگر زوجین میں خلوت ہونے سے پہلے ہی یہ واقعہ وجود میں آگیا، تو سارے ائمہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ان کا نکاح فوراً ٹوٹ جائے گا اور خلوت ہو چکنے کے بعد ایسا ہوا تو شافعی اور حنبلی علماء کے نزدیک عورت کی مدت ختم ہونے تک اس کا نکاح باقی رہے گا، اس دوران اگر مرتد ہو جائے تو الا فریق اسلام میں واپس آجائے تو یہ نکاح بدستور برقرار رہ جائے گا، ورنہ فسخ قرار پائے گا۔

حکیم نے خاصے اہتمام سے بیان فرما رکھا ہے۔ سورہ بقرہ آیت (۲۲۲) کے جو الفاظ اوپر نقل کیئے گئے ہیں اور جن میں ”مشرک عورتوں“ اور ”مشرک مردوں“ سے نکاح کی ممانعت کا اعلان کیا گیا ہے، ان کے بعد ہی ارشاد ہوتا ہے کہ:-

أُولَٰئِكَ يَدْعُونَ إِلَى النَّارِ وَاللَّهُ يَدْعُو إِلَى الْجَنَّةِ
وَالْمَغْفِرَةِ بِأَذْنٍ وَيُبَيِّنُ ۖ يَأْتِيهِمُ النَّاسُ لَعَلَّهُمْ
يَتَذَكَّرُونَ۔

”یہ (اہل شرک) تمہیں جہنم کی طرف بلا رہے ہیں، جب کہ اللہ اپنی توفیق بخشی سے جنت اور مغفرت کی طرف بلاتا ہے۔ وہ اپنی ہدایتوں کو لوگوں کے سامنے کھول کر بیان کر دیتا ہے، تاکہ وہ یاد دہانی حاصل کریں۔“

یعنی اس ممانعت کی اصل غایت اور حقیقی وجہ یہ ہے کہ مومن کی متابع ایمان محفوظ رہے۔ چونکہ ان لوگوں سے ازدواجی رفاقت جیسا دائمی، پائیدار اور گہرا جذباتی رشتہ قائم کرنا، جو اسلام کو اپنا دین نہیں مانتے، مسلمان کے ایمان و اسلام کو خطرے میں ڈال دے سکتا ہے، اس لئے ضروری ہوا کہ ان سے ایسا رشتہ جوڑنے کی قطعی ممانعت کر دی جائے۔

یہ بات کہ ایسا رشتہ مسلمان کی متابع ایمان کے لئے خطرہ بن سکتا ہے، کوئی واہمہ یا مفروضہ نہیں ہے، بلکہ ایک کھلی ہوئی اور ناقابل انکار حقیقت ہے۔ زوجین کا تعلق کوئی وقتی یا معمولی یا کاروباری تعلق نہیں ہوتا، کہ ان کی باہمی وابستگی بس ایک خاص حد کے اندر ہی محدود رہ جانے والی ہو اور

ان کے شخصی افکار اور میلانات کو متاثر کر لینے کی کوئی صلاحیت نہ رکھتی ہو۔ یہ تو ایسا طبع معمولی تعلق ہوتا ہے جو مستقل، دائمی اور غیر محدود بھی ہوتا ہے اور انتہائی گہرا، جذباتی اور پائیدار بھی۔ یہ بالکل فطری طور پر زمین کو باہم شہر و شکر بنادینا چاہتا ہے، اور اس بات کے لئے مسلسل زور لگاتا رہتا ہے کہ وہ اپنی پسند و ناپسند، اپنے جذبات اور اپنے افکار میں بھی زیادہ سے زیادہ قریب آتے جائیں۔ اس حقیقت کی موجودگی میں ان کے مابین افکار اور خیالات کے کسرو اکھسار اور لین دین کے عمل کا جاری رہنا کوئی غیر متوقع بات نہیں ہو سکتی۔ اس لئے اس خطرے کا انکار نہیں کیا جاسکتا کہ غیر مسلم رفیقہ جیات یا رفیق جیات اپنے مسلمان شریک زندگی کو اپنے مخالف اسلام عقائد و افکار سے متاثر کر لے جس شخص کی بھی نظر انسانی نفسیات پر ہوگی وہ اس زبردست اور عملی امکان کو تسلیم کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

پیر ایمان و اسلام کی تباہی کا یہ خطرہ صرف اُس شخص کی ذاتِ خاص ہی تک محدود رہ جانے والا نہیں، جس نے کسی منکر اسلام سے نکاح کا رشتہ قائم کر لیا ہو، بلکہ وہ لازماً آگے بڑھے گا اور بڑھ کر اس کی اولاد کو بھی اپنی زد میں لے لے گا، پھر کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کیا بن کر اُٹھے گی۔ وہ عقیدوں کے تضاد کا شکار بھی بن سکتی ہے، اور کفر یا شرک یا الہاد کی آغوش میں بھی چلی جاسکتی ہے۔ آخر مسلم اور غیر مسلم جوڑے سے پیدا ہونے والے بچے اپنی غیر مسلم ماں یا باپ کے عقائد و افکار سے کلیتہً کیسے محفوظ رہ جائیں گے؟ اور ان کی ذہنی اٹھان پر ان عقائد و افکار کا بھی پرتو کیوں نہ پڑے گا؟

اب کسی اور کے نہیں، ایک مسلمان کے ذہن سے سوچے کہ اس خطرے کا حقیقت بن جانا، جو بہر حال ممکن اور متوقع ہے، کیا معنی رکھتا ہے؟ کیا اسے انگیز کرنے کی بات وہ سوچ بھی سکتا ہے؟ دوسروں کی نظر میں ایسا واقعہ جیسے جتنا بھی غیر اہم بلکہ خوش آئند ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن ایک مسلمان کی نظر میں، جب تک وہ مسلمان ہے، اس سے بڑا المناک سانحہ اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ اس کے نزدیک ایمان ہی تو ایک مسلمان کی اصل پونجی ہوتی ہے۔ اسی پر اس کا مسلمان ہونا موقوف ہوتا ہے۔ یہ نہ ہو تو وہ مسلمان، لفظ کے کوئی معنی ہی نہیں رہ جاتے۔ دنیا کے سارے مفادات اور تمام مصالح مل کر بھی اس کی قیمت کو نہیں پہنچ سکتے۔ یہ وہ سرمایہ ہے جسے کھو دینے کے بعد اس کا سب کچھ کھو جائے گا۔ اس لئے ایک مسلمان کے لئے اس سے زیادہ بے عقلی اور بد بختی کی بات اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی کہ اتنے قیمتی سرمائے کی طرف سے غفلت برتے، یا دنیا کی کسی بھی مصلحت کی خاطر اسے خطرے میں ڈال دے۔ معقولیت اور دانش مندی کا تقاضا بدابہت صرف یہ ہو گا۔ کہ اس ایمان کی ہر قیمت پر حفاظت کی جائے، پوری احتیاط کے ساتھ کی جائے، صرف سامنے دکھائی دینے والے واقعی خطرات ہی سے نہیں، بلکہ دور کے امکانی خطرات سے بھی کی جائے۔ یعنی نہ تو کسی واقعی خطرے کو انگیز کیا جائے نہ کسی امکانی خطرے کو مول لیا جائے۔

اس بارے میں قرآن کریم کا جو مطالبہ یا نقطہ نظر ہے وہ اس کے اس ارشاد سے اور زیادہ اچھی طرح سمجھ میں آجائے گا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا آبَاءَكُمْ وَأَخْوَانَكُمْ
أَوْلِيَاءَ إِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْإِيمَانِ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ
فَإُولَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ۔ (توبہ - ۲۳)

”اے ایمان والو! اگر تمہارے باپ اور تمہارے بھائی ایمان پر کفر

کو ترجیح دیں تو انہیں اپنا رفیق نہ بناؤ۔ تم میں سے جو لوگ بھی ان سے رفاقت

رکھیں گے وہ بڑے ظالم (حق ناشناس) ہوں گے۔“

باپ بیٹے اور بھائی بھائی کے درمیان پائے جانے والے رشتے دنیا کے مضبوط ترین رشتے ہوتے ہیں، پھر پیدائشی اور فطری طور پر آپ سے آپ قائم شدہ بھی ہوتے ہیں۔ ایسا نہیں کہ وہ پہلے سے موجود نہ ہوں اور حسب مرضی انہیں قائم کیا جاتا ہو۔ لیکن آیت کریمہ کا فرمانا ہے کہ ایک مومن کے لیے ایسے رشتے بھی اپنی اہمیت بڑی حد تک کھودیتے ہیں اگر کفر اور ایمان کا اختلاف درمیان میں حائل ہو، اور ایسے باپ یا ایسے بھائی کے انسانی، اخلاقی اور سماجی حقوق اگرچہ اپنی جگہ قابل احترام اور واجب الادا ہی رہیں گے، لیکن انہیں اپنا ”ولی“ (دلی دوست اور سچا رفیق) ہرگز نہ بنایا جاسکے گا۔ غور کیجیے، جس دین کی نگاہ میں ایمان اور اختلاف اتنی زبردست اہمیت رکھتا ہو کہ اس کی موجودگی میں ایسے مضبوط ترین خونی رشتے بھی اپنا فطری مقام کھودیتے ہیں وہ کسی منکر اسلام سے ازدواجی رشتہ قائم کرنے کی اجازت کیسے دے سکتا ہے۔ جب کہ یہ رشتہ نہ صرف مذکورہ خونی رشتوں سے کسی طرح بھی کم طاقتور نہیں ہوتا بلکہ شریعت اس سے جو مقاصد حاصل کرنا چاہتی ہے وہ اس وقت تک

حاصل ہو ہی نہیں سکتے۔ جب تک وہ فی الواقع ایسا ہی غیر معمولی حد تک طاقتور نہ رہے، دوسرے لفظوں میں گویا بات یہ ہوئی کہ اس رشتہ کو گہرائی اور گیرائی کے اعتبار سے کچھ اسکا پایہ کا ہونا چاہیئے جو 'دلی دوستی اور سچی رفاقت' (ولایت) کا ہوا کرتا ہے۔ جب پیدائشی بنیاد پر اور آپ سے آپ قائم شدہ خونی رشتے بھی انکار اسلام کے باعث اس قابل بن جاتے ہیں کہ ان کے بارے میں چوکنہ رہا جائے تو پھر ایسی صورت میں نکاح کے رشتے جوڑنے کا سوال ہی کہلا جاتا رہ سکتا ہے جو پیدائشی طور پر آپ سے آپ موجود بھی نہیں ہوتا بلکہ قصداً و ارادے سے وجود میں لایا جاتا ہے۔

اہل شرک و کفر سے اہل ایمان کے ازدواجی رشتے کس طرح ان کی ایمانی ہلاکت کے موجب بن سکتے ہیں، اس کا بدترین عمل تجزیہ بنی اسرائیل کی تاریخ میں ہو چکا ہے۔ بارہا ایسا ہوا کہ انہوں نے ہدایت الہی کو پس پشت ڈال کر گرد و پیش کی بُت پرست قوموں سے شادی بیاہ کے سلسلے شروع کر دیئے اور اس کے نتیجے میں ان کے اندر بھی مشرکانہ عقائد و افکار کی گرم بازاری ہو گئی۔

غرض اسلام کے منکر افراد سے نکاح کو یکسر ممنوع قرار دینے کا سب سے اہم اور بنیادی منشاء قرآن حکیم کا یہی تھا کہ مسلم معاشرہ اپنے افراد کے ایمان کی تباہی کے خطرات سے محفوظ، اور کفر و شرک اور الحاد کے جراثیم سے پاک رہے۔

۲۔ مقاصدِ نکاح کا تحفظ

دوسری اہم وجہ اور بڑی مصلحت اس مانعت کی یہ ہے کہ نکاح کے مقاصد کو ناکامی کے اُن خطرات سے محفوظ رکھا جائے جو، زوجین میں دینی اختلاف کی بنا پر، لازماً پیدا ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ ایسے زبردست اختلاف کے ہوتے ہوئے

لے دینی اختلافات تو دینی اختلافات، خالص دنیوی اندازِ فکر کا اختلاف بھی اپنے اندر اتنی قوت رکھتا ہے کہ نکاح کے رشتے کو بُری طرح مجروح کر کے رکھ دے، مثلاً آدمی اگر کسی نامذہبی نظامِ فکر و عمل کا مخلص پیرو ہو تو اس کے لئے کسی ایسی شریکِ حیات کے ساتھ ازدواجی رشتے کو برقرار و بامراد بنائے رکھنا آسان نہ ہو گا جس کی عقیدت کسی اور ہی نظام سے وابستہ ہو۔ اس کی ایک بہت نمایاں اور تازہ مثال اسٹالن کی بیٹی، مسز سوٹیلانا کا واقعہ ہے، جس نے چند سال پہلے روس کو خیر باد کہہ کر ہندوستان میں، اور پھر یہاں سے بھی نقل مکانی کر کے امریکہ میں سکونت اختیار کر لی۔ اور ایک شخص، ولیم پیٹرز، سے شادی کر لی تھی۔ پھر ۲۳ فروری ۱۹۵۲ء کے اخبارات سے یکایک اطلاع ملی کہ اس نے اپنے شوہر سے علیحدگی اختیار کر لی ہے اور ستمبر ۱۹۵۲ء ہی میں اپنے دس مہینے کے بچے کو لے کر کہیں چلی گئی ہے۔ مسٹر ولیم پیٹرز نے اپنی اس علیحدہ ہو جانے والی بیوی کے اس اقدام پر خود رائے زنی کرتے ہوئے کہا کہ ”طلاق ناگزیر ہے، کیونکہ اُن کی بیوی اس طبقے کی زندگی اپنا سکتی ہے“ اس کیوجہ ولیم پیٹرز کی جائزے کے مطابق یہ ہے کہ مسز سوٹیلانا کی گھٹی میں کمیونزم پڑا ہوا ہے“ غور کرنے کی بات ہے۔ اگر ازدواجی رشتے کے حق میں کمیونزم اور کیٹلزم کا اختلاف یہ نتیجہ پیدا کر سکتا ہے۔ تو پھر اسلام اور انکارِ اسلام کا اختلاف نہ کیا کچھ نہ کر سکے گا۔

ان کے دلوں کا باہم جڑا رہنا اور ان کی ازدواجی زندگی میں سکون اور ہم آہنگی کا پایا جانا قریب قریب ناممکن ہی ہوگا، الا آئیکہ اس رشتہ ازدواج کا مسلمان فرد بے اسلام اور بے ایمان کا مسلمان ہو، جسے اپنے مسلمان ہونے کی معنویت سے کوئی سروکار ہی نہ ہو۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہاں گفتگو ایک اسلامی قانون کی معقولیت اور ضرورت کے بارے میں ہو رہی ہے، اور اسلامی قانون اسلام کے واقعی ماننے والوں کے لئے ہوتا ہے نہ کہ اس سے بے پروا لوگوں کے لئے، اس لئے اس کی معقولیت اور ضرورت کو جاننے کے لئے سامنے صرف اپنی لوگوں کو رکھا جانا چاہیے۔ جو فی الواقع مسلمان ہوں، اور جہاں تک واقعی مسلمانوں کا تعلق ہے، یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ ان کے لئے غیر مسلموں سے قائم کیا جانے والا رشتہ ازدواج کبھی سکون بخش اور کامیاب ثابت نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ایسے رشتے کی صورت حال یہ ہوگی کہ زوجین میں سے ایک تو حیدر خالص پر ایمان رکھتا اور شرک و بت پرستی کو گمراہی اور الحاد و مادیت کو جہالت سمجھتا ہوگا، قرآن کو اللہ کا نازل کیا ہوا ہدایت نامہ، اور صاحب قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا رسول تسلیم کرتا ہوگا، آخرت پر یقین رکھتا ہوگا، اور عقائد و افکار میں، اخلاق و اعمال میں، خیر و شر کے معیار میں، پسند، ناپسند کے معاملے میں اللہ کی کتاب اور رسول کی سنت ہی کو پہلی اور آخری سند قرار دیتا ہوگا۔ اور دوسرا یا تو خدا کے وجود ہی کا قائل نہ ہوگا یا ایک سے زائد خداؤں کو مانتا ہوگا وحی اور رسالت کے تصور تک سے نا آشنا اور قرآن و اسلام کا منکر ہوگا، اپنے لئے عقائد و افکار اور اخلاق و اعمال کا سرچشمہ ہدایت کچھ اور ہی رکھتا ہوگا۔

— سوچئے، جہاں درمیان میں اتنے طویل ذہنی اور باطنی فاصلے مائل ہوں وہاں آپس کی دلی الفت، جذباتی ہم آہنگی، فکری یک جہتی اور پرسکون رفاقت کی کیا صورت بن پڑ سکے گی۔ کیا نفسیاتی طور پر ایسی توقع کرنا حق بجانب ہوگا؟ ظاہر ہے کہ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسا ازدواجی رشتہ بس ایک صحبت ناجنس بنا رہے گا، اور قدم قدم پر افکار، جذبات اور میلانات کا ٹکراؤ ہوتا رہے گا، جس کے نتیجہ میں دونوں کی زندگی سکون سے، اور گھر کی فضا مودت و رحمت کی خنکیوں سے محروم ہی رہے گی۔ حالانکہ یہی سکون اور مودت و رحمت، جیسا کہ اوپر ابھی معلوم ہو چکا، اس رشتے کی جان ہے، نکاح کا مقصود ہے، ایسا مقصود جو خود تو اہم ہے ہی، دوسرے مقاصد کی صحیح تکمیل کے لئے بھی ضروری ہے۔ کیونکہ جس جوڑے کی ازدواجی زندگی تلخ و ناخوش گوار ہو وہ ان مقاصد کو صحیح معنوں میں کبھی حاصل نہیں کر سکتا۔ جو عقد نکاح کی غرض و غایت ہیں۔ اسلام کی نگاہ چونکہ مقاصد سے کبھی نہیں ہٹتی، اور نہ ہٹنی چاہیے تھی، اس لئے، دوسرے مصالح کے علاوہ، خود مقاصد نکاح کے تحفظ کی خاطر بھی ضروری تھا کہ وہ مسلمانوں کو غیر مسلموں سے نکاح کرنے کی ممانعت فرمادے۔

از روئے حقیقت یہ ہیں وہ اہم وجوہ مصالح، جن کی بنا پر اہل اسلام اور غیر اہل اسلام کے مابین ازدواجی رشتے کو ممنوع ٹھہرایا گیا ہے۔ ضروری ہے کہ اس قانون کی ضرورت اور معقولیت کا جائزہ انہی مصالح کی روشنی میں لیا جائے، نہ کہ کسی اور بنیاد پر: بلا خوف تردد کہا جاسکتا ہے کہ جو شخص بھی راست فکری سے کام لے گا اور جائزہ کا صحیح طریقہ اختیار کرے گا، وہ شریعت کے اس قانون

کو اسلامی معاشرے کی ایک ناگزیر ضرورت تسلیم کیے بغیر نہ رہے گا، وہ آگے نہ تو کسی علیحدگی پسندانہ مذہبے کا شاخسانہ ٹھہرائے گا نہ اس کے اندر کسی گروہی یا ملی منافرت کی کارفرمائی پائے گا، بلکہ صاف محسوس کرے گا کہ یہ قید اور ممانعت یقیناً ایک مسلمان کی دینی ضرورت بھی ہے اور دنیوی بھی، اس کے ایمانی مفاد کا بھی تقاضا ہے اور معاشرتی مفاد کا بھی۔

۲۔ اہل کتاب کی عورتوں سے جوازِ نکاح کا استثناء

جوازِ نکاح کے لئے ہم دینی کی شرط کے اس حکم میں ایک، اور صرف ایک، استثناء بھی ہے، اور وہ یہ کہ غیر مسلموں میں سے اہل کتاب، یعنی یہودی اور عیسائی، عورتوں سے مسلمان مرد کا نکاح جائز ہے، جب کہ یہودی اور عیسائی مردوں سے

لے اگرچہ کچھ لوگوں کو اس سے بھی اختلاف ہے، اور وہ کتابیہ سے بھی نکاح کو ممنوع ہی قرار دیتے ہیں۔ صحابہؓ میں سے حضرت امی عمرؓ کا، ایک روایت کے مطابق یہی خیال تھا (بدایت المجتہد، جلد دوم ص ۴۴) فرقہ امامیہ اور کچھ زیدی علماء کا بھی یہی مسلک ہے (روح المعانی حصہ دوم ص ۱۱۸) ان لوگوں کے نزدیک سورہ نساء کی آیت (لَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ الْغَنِيَّاتِ اُولَئِكَ يَرْفَعْنَ رُءُوسَهُنَّ عَلَى كَلِمَاتِ اللَّهِ وَلَهُنَّ اَلْأَلْوَاحُ وَتُحْمَلُهُنَّ فَهِنَّ عَجِزَاتٌ) اور سورہ مائدہ کی آیت (وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكِينَ حَتَّىٰ يَخْرُجُوا مِنْ دِيَارِكُمْ) سے نکاح کا رشتہ قائم کرنے کی جو ممانعت ہے اس نے سورہ مائدہ کی آیت (يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكِينَ حَتَّىٰ يَخْرُجُوا مِنْ دِيَارِكُمْ) اور سورہ نساء کی آیت (وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكِينَ حَتَّىٰ يَخْرُجُوا مِنْ دِيَارِكُمْ) سے نکاح کی پائی جانے والی اجازت کو منسوخ کر دیا ہے۔ لیکن یہ خیال نہ صرف یہ کہ جمہور اُمت کے خلاف ہے۔ بلکہ دلائل کے اعتبار سے بھی بہت کمزور ہے۔

مسلمان عورتوں کا نکاح بدستور ناجائز اور ممنوع ہی ہے۔ یہ استثنا قرآن مجید کے اس ارشاد میں مذکور ہے:-

الْيَوْمَ أَحِلَّ لَكُمْ الطَّيِّبَاتُ وَالْمُعْصَنَاتُ
مِنَ الْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُعْصَنَاتُ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ
مِنْ قَبْلِكُمْ الْخ (مائدہ، ۵)

”آج تمہارے لئے ساری پاکیزہ چیزیں حلال کر دی گئیں نیز مومن شریف عورتیں اور ان لوگوں میں کی شریف عورتیں بھی جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی تھی الخ“

یہ استثنا، اور اہل کتاب کی عورتوں تک اس استثنا کی محدودیت، دو باتوں کی وجہ سے ہے:-

ایک تو یہ کہ جس علت کی بنا پر، اور جن مصلحتوں کی خاطر، اہل کفر اور اہل شرک سے نکاح کرنا ممنوع ٹھہرایا گیا ہے، اگرچہ وہ بدستور اہل کتاب کے معاملے میں بھی سمجھ دہوتی ہیں، لیکن امر واقعہ یہ بھی ہے کہ یہاں ان کی نوعیت بہت کچھ مختلف، اور ان کی اہمیت نسبتاً کم شدید ہوتی ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اگرچہ اہل کتاب بھی اسلام کے منکر اور شرک یا کفر کے مرتکب ہوتے ہیں، تاہم اسلام سے ان کی دوری اور اجنبیت اس درجے کی نہیں ہوتی جس درجے کی دوسرے غیر مسلموں کی ہوا کرتی ہے۔ ایسا اس لئے ہے کہ ان کے دینی عقائد اور بنیادی تصورات بڑی حد تک فی الجملہ وہی ہیں جو اسلام کے ہیں۔ اللہ، آخرت، رسالت، وحی، کتاب، اور ملائکہ وغیرہ ایمانیات کو اپنے طور پر وہ بھی جانتے اور ملتے ہیں۔

اسلام سے ”مرتج بنیادی اختلاف“ انہیں جو کچھ ہے وہ صرف قرآن کریم اور نبوت بھی پر ایمان رکھنے کا اختلاف ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ ان کا کھلا ہوا ”کفر“ (انکارِ حق) قرآن کو خدا کی کتاب، اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا رسول نہ ماننے تک محدود ہے۔ جب کہ دوسرے غیر مسلم صرف قرآن اور نبوت محمدی ہی کے منکر نہیں ہوتے، بلکہ اسلام کے بہت سے دوسرے بنیادی عقائد اور تصورات کے بھی منکر یا ان سے بالکل ناواقف ہوتے ہیں، اس لئے قدرتی طور پر اہل کتاب اوروں کے برخلاف، ایک حد تک اسلام آشنا بھی ہوتے ہیں اور اپنے ذہن کے فکری اور مذہبی سانچے کے اعتبار سے مسلمانوں کے قریب بھی۔ دوسری بات یہ کہ عورت کی فطرت میں قدرت نے مرد کے افکار پر اثر انداز ہونے کے مقابلہ میں اس کا اثر قبول کرنے کی صلاحیت زیادہ رکھی ہے، جب کہ مرد کا حال برعکس ہے، وہ اپنے افکار اور رجحانات کا پرتو عورت کے ذہن پر ڈالتا زیادہ ہے اور اس کا اثر قبول کم کرتا ہے۔

ان دونوں حقیقتوں کو اگر سامنے رکھا جائے تو اس بات کا سمجھ لینا بالکل آسان ہو جائے گا کہ دائرۂ اسلام سے باہر ہونے کے باوجود کتابی عورت سے مسلمان مرد کو نکاح کی اجازت کیوں دی گئی ہے، اور کتابی مرد سے مسلمان عورت کا نکاح بدستور ممنوع ہی کیوں رکھا گیا ہے؟ عام غیر مسلموں سے ازدواجی رشتہ قائم کرنے کی ممانعت کا بنیادی مقصد، جیسا کہ اوپر تفصیل سے معلوم ہو چکا، مسلمان کے ایمان کا تحفظ ہے۔ لیکن ان دونوں حقیقتوں کی بنا پر کتابی عورت سے اس بات کا خطرہ نہ ہونے کے برابر ہے گا کہ وہ اپنے مسلمان شوہر کو — بشرطیکہ وہ واقعی

مسلمان ہو۔۔۔ ایمان اور اسلام سے برگشتہ کر دے گی اور اُسے 'اگ' کی طرف کھینچ لے جائے گی۔ نہ صرف یہ کہ یہ خطرہ نہ ہونے کے برابر رہے گا، بلکہ توقع اس امر کی ہوگی کہ وہ اپنی انفعالی فطرت کی بنا پر اپنے مسلمان شوہر کا اثر قبول کر کے، اور ایک ماحول اور معاشرے کے اندر رہنے سہنے کے نتیجہ میں خود اسلام کی طرف کھینچ آئے گی۔۔۔ اس کے بخلاف اگر کسی کتابی مرد سے کسی مسلمان عورت کا نکاح ہو جاتا ہے تو زیادہ امکان اس بات کا رہے گا کہ اس کا ایمان اور اسلام محفوظ نہ رہ جائے۔ کیونکہ اس صورت میں اس کا شوہر فطری اور سماجی دونوں حیثیتوں سے اس پر اثر انداز ہونے کی پوزیشن میں ہوگا، اور وہ اپنی انفعالی فطرت کی بنا پر اس کے عقائد و افکار کا رنگ اختیار کر لینے کے امکان سے مسلسل دوچار رہے گی۔ اس کے علاوہ ایک عیسائی یا یہودی معاشرہ کی بود و باش بھی اس امکان کو برابر غذا دیتی رہے گی۔ ان ساری باتوں کا نتیجہ یہ یقیناً نکل سکتا ہے کہ وہ بالآخر اسلام کی دولت کھو بیٹھے۔ پھر جہاں تک اس سے پیدا ہونے والی اولاد کا تعلق ہے، اس کے بارے میں تو تناؤ سے فی صدامکان اس بات کا ہے کہ وہ مسلمان نہیں بلکہ کتابی (عیسائی یا یہودی) ہی بن کر اُٹھے گی۔ ان دو برے سنگین خطرات کا کھلا ہوا تقاضا یہی تھا کہ مسلمان عورت کا کتابی مرد سے نکاح کسی حال میں جائز نہ رکھا جاتا۔

اس وضاحت کی روشنی میں صاف دیکھ لیا جاسکتا ہے کہ اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح کی اجازت کی بات ہو یا ان کے مردوں سے نکاح کی ممانعت کا مسئلہ، ہر ایک کی بنیاد اور حقیقی محرک فی الواقع وہی اہم ترین دینی مصلحتیں ہیں جنکی خاطر اہل شرک و

کفر سے نکاح کو ممنوع ٹھہرانا پڑا ہے یعنی ایمان کی حفاظت اور مقاصدِ نکاح کا تحفظ ان کے
 سوا دوسرا کوئی بھی جذبہ یا محرک نہ اس اجازت کے پیچھے پایا جاسکتا ہے نہ اس ممانعت کے
 اسلامی قانونِ نکاح کی یہ دفعہ دراصل اسلام کی وسعتِ نظر اور اتحادِ پسندی
 کا ثمرہ ہے، ورنہ بے لچک اصولِ پسندی کا ظاہری تقاضا ہی تھا کہ کتابی عورتوں
 سے بھی نکاح کی اجازت کا دروازہ اسی طرح بند رکھا جاتا جس طرح دوسرے سارے
 غیر مسلموں کے سلسلے میں بند رکھا گیا ہے۔ کیونکہ اُس خوش آئند توقع کے باوجود جو
 کتابی عورت کے دائرہ اسلام میں داخل ہونے کی بابت رکھی جاسکتی ہے، یہ
 رشتہ ازدواج بھی خطروں اور مفسدوں کے امکان سے یکسر پاک نہ تھا، اور پوری
 احتیاط اسی میں تھی کہ مسلمانوں کو اس سے کلیتہً دور رہنے کا حکم دے دیا جاتا۔
 اس کے باوجود اگر اس نکاح کی اجازت دے دی گئی ہے تو یہ اس امر کی کھلی
 ہوئی دلیل ہے کہ اسلام جہاں تک ہو سکے رواداری سے کام لینا چاہتا ہے، وہ
 عام انسانوں سے کٹنے کے بجائے اُن سے جڑنے کی خواہش رکھتا اور اس کیلئے
 راہیں تلاش کرتا ہے، اور اس سلسلے میں آگے قدم بڑھانے سے وہیں رکنا ہے
 جہاں کوئی واقعی مجبوری اُن مائل ہوتی ہے۔ جیسا کہ معلوم ہو چکا، ازدواجی رشتوں
 کے قائم کرنے کے معاملے میں یہ مجبوری صرف دین و ایمان اور مقاصدِ نکاح کے
 لئے خطرات کی مجبوری ہے

یہاں ایک بحث ان لوگوں کے بارے میں بھی اُٹھتی ہے جنہیں فقہ کی اصطلاح
 میں ”شُبہ اہل کتاب“ (اہل کتاب کے مشابہ) کہا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا
 انہیں بھی اہل کتاب پر قیاس کیا جائے گا اور ان کی عورتوں سے بھی مسلمانوں کا

نکاح جائز سمجھا جائے گا؟ اس مسئلہ میں ظاہر ہے، بنیادی چیز دیکھنے کی یہ ہوگی کہ اسلام ان کے لئے کتنا اجنبی ہے اور اس کے عقائد و تصورات سے ان کی دوری کس حد کو پہنچی ہوئی ہے؟ اگر حقیقت واقعی یہ ہو کہ اسلام سے ان کی یہ دوری اور اجنبیت تقریباً اتنی ہی اور ویسی ہی ہے، جتنی اور جیسی یہودیوں اور عیسائیوں کی ہے تو اصول کا تقاضا یہی ہو گا کہ ان کی بھی عورتوں سے نکاح کو جائز سمجھا جائے لیکن امر واقعہ یہ نہ ہو تو پھر جواز کا فتویٰ نہ دیا جاسکے گا۔ اب جہاں تک امر واقعی کا تعلق ہے، دنیا کی دوسری کوئی بھی غیر مسلم قوم یا ملت ایسی نظر نہیں آتی جو اسلام سے یہودیوں اور عیسائیوں جتنی ذہنی قربت اور شناسائی رکھتی ہو، اس لئے کسی بھی دوسرے غیر مسلم گروہ کی عورتوں سے نکاح جائز نہیں ہو سکتا۔ خواہ وہ شبہ اہل کتاب ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ جمہور علمائے اسلام کا یہی مسلک ہے، اور چاروں امام اس پر متفق ہیں کہ شبہ اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح ناجائز اور حرام ہے، البتہ امام داؤد ظاہریؒ اس کے جواز کے قائل ہیں۔

۳۔ عورتوں کے معاملہ نکاح میں سرپرستوں کا حق ولایت

ایک عاقل بالغ مرد تو اپنا نکاح خود کر لینے کا پوری طرح اہل اور مجاز ہے۔ لیکن جہاں تک بالغ لڑکیوں اور عورتوں کا تعلق ہے، معاملہ قدرے مختلف ہے۔ کیونکہ ان کے نکاح کے معاملے میں ان کے 'اولیاء' (سرپرستوں) کی رضامندی

اور اذن کو بھی غاصد دخل حاصل ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہ مائل بالغ ہونے کے باوجود اپنے نکاح کے معاملے میں اس طرح آزاد اور خود مختار نہیں ہیں جس طرح مرد ہیں۔ ان کی یہ آزادی اور خود مختاری کس حد تک محدود ہے۔ اور ان کے اولیاء کو ان کے نکاح کے معاملے میں کہاں تک دخل ہونے کا حق ہے، اس بارے میں علمائے اسلام کی رائیں مختلف ہیں۔

حنفی علماء کے نزدیک عورت جب سن بلوغ کو پہنچ گئی تو اب اس کے شرعی ولی کو اس کے نکاح کے معاملے میں قانونی طور پر دخل دینے کا حق صرف اس حد تک رہے گا کہ اسے مہر مثل سے کم پر یا غیر کفو سے نکاح نہ کرنے دے، اور اگر اس نے ایسا کر لیا ہو تو عدالت سے رجوع ہو کر پہلی صورت میں مہر کو مہر مثل کے برابر گرا دے اور دوسری صورت میں اس نکاح کو فسخ کرا لے۔ ولی کا حق مداخلت بس اسی حد تک محدود ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی بالغ لڑکی، خواہ وہ باکرہ ہو خواہ ثیبہ (پہلے سے شوہر دیدہ) اپنی حیثیت کے مطابق مہر کے ساتھ کسی مرد سے، جو اس کا کفو (ہم سر) ہو، از خود نکاح کر لیتی ہے، اور اس سلسلے میں اپنے ولی کی رضا اور اذن بھی حاصل نہیں کرتی، تو وہ قانوناً اس کی پوری طرح مجاز ہے۔ (اگرچہ پسندیدہ اور مطلوب شکل پھر بھی یہی ہے کہ عورت اپنے ولی کی رضا اور اذن کے بغیر اپنا نکاح نہ کرے، بلکہ اس کے اذن سے اور اسی کے اہتمام میں نکاح کرائے)۔

شافعی، مالکی اور حنبلی علماء کے نزدیک اولیاء (سرپرستوں) کا حق مداخلت بہت وسیع ہے۔ ان کی رائے میں عورت، خواہ وہ باکرہ ہو خواہ ثیبہ، اپنے ولی

کے توسط کے بغیر نکاح کر ہی نہیں سکتی، اگر کر لے گی تو وہ باطل اور کالعدم ہوگا حتیٰ کہ کچھ شرطوں کے ساتھ باپ کو، اور بعضوں کے نزدیک باپ کی عدم موجودگی میں دادا کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ بالغ باکرہ یا نابالغ شیبۂ کانسکاح وہ اس کی رضامندی حاصل کیے بغیر از خود کر دیں۔ البتہ بالغ شیبۂ کے بارے میں وہ اس طرح کا کلی اختیار نہیں رکھتے۔

اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کریم یا صحیح اور متفق علیہ احادیث کے اندر اس بارے میں کوئی واضح ہدایت موجود نہیں ہے۔ چنانچہ جن آیتوں میں عورتوں کے نکاح کی بابت گفتگو آئی ہے ان میں انداز بیان دو طرح کے اختیار کیے گئے ہیں: بعض آیتوں میں تو ان کے معاملہ نکاح کی انجام دہی کی نسبت مردوں، یعنی ان کے سرپرستوں کی طرف دکھائی دیتی ہے۔ مثلاً سورہ بقرہ کے مذکورہ بالا آیت ”وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكِينَ“ (اپنی عورتوں کو مشرک مردوں کے نکاح میں نہ دو) اور کچھ آیتوں میں یہ نسبت خود ان عورتوں کی اپنی ہی طرف کی گئی ہے۔ مثلاً سورہ بقرہ کی آیت (۲۳۰) ”..... حَتَّى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ“ (..... یہاں تک کہ عورت کسی اور شوہر سے نکاح کر لے) اور آیت (۲۳۴) ”..... فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا قَعَلْتُمْ فِي أَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ“ (..... پس یہ عورتیں اپنے بارے میں ”معروف“ کے

مطابق جو کچھ کریں اس کے سلسلے میں تم پر کوئی الزام نہیں، کچھ یہی حال اس حدیث کا بھی ہے۔ جو اس مسئلے کے بارے میں متفقہ طور پر صحیح ترین حدیث ہے، اور جس کے الفاظ یہ ہیں:-

أَلَا يَسِرُّ أَحَقُّ بِنَفْسِهَا مِنْ وَلِيِّهَا وَالْبُكَرُ تُسَادُّونَ
فِي نَفْسِهَا وَإِذْنُهَا صَمَاتُهَا۔ (مسلم۔ کتاب النکاح ص ۲۵۵)

” (پہلے سے) شوہر دیدہ عورت اپنے نکاح کا معاملہ کرنے کا اپنے ولی سے زیادہ حق رکھتی ہے۔ باکرہ کے نکاح کے بارے میں اس کی اجازت حاصل کی جانی چاہیے۔ (اس اجازت طلبی کے جواب میں) اس کی خاموشی بھی اس کی اجازت (کے ہم معنی) ہوگی۔“

اس حدیث پر، اور مذکورہ بالا آیتوں کے پس منظر اور انداز بیان پر ایک ساتھ نظر ڈالیے اور ساتھ ہی اسلام کے اس نقطہ نظر کو بھی سامنے رکھیے کہ ہر عاقل بالغ شخص کو اپنے ذاتی معاملات میں فیصلے کا آزاد، لیکن ساتھ ہی پابند حدود، اختیار حاصل ہے، تو حنفیہ ہی کا مسلک صحیح معلوم ہوتا ہے۔ آخری آیت اس سلسلے میں خصوصیت سے قابل توجہ ہے۔ ایک طرف تو اس کے الفاظ ”مَا فَعَلْنَ فِي أَنْفُسِهِنَّ“ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ عورتیں اپنے معاملہ نکاح کو خود انجام دے لے سکتی ہیں، دوسری طرف ”بِالْمَعْرُوفِ“ کے لفظ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کا یہ حق خود مختاری اسی شکل میں قابل احترام رہے گا جب اسے انہوں نے ”معروف“ (یعنی عام شریفانہ دستور) کے مطابق استعمال کیا ہو۔ واضح رہے کہ اس ”معروف“ میں یہ بات بھی لازماً اور بدرجہ اولیٰ شامل ہے کہ عورت جس

شخص سے اپنا نکاح کر رہی ہو وہ اس کا کفو (ہمسر) ہو۔ کیونکہ یہاں اس آیت میں جس معروف کا حوالہ دیا گیا ہے اس سے مراد اُس وقت کے عرب معاشرے کا معروف ہے، اور اس معروف کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ اس کے اندر کفائت (ہمسری) کو کیا اہمیت حاصل تھی۔ ان ساری باتوں پر نظر رکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عورت اپنے ولی کے توسط کے بغیر خود ہی اپنا نکاح کر لیتی ہے اور اس میں ”معروف“ کی پابندی کرتے ہوئے کفائت کو بھی ملحوظ رکھتی ہے تو اس آیت قرآنی کی رو سے وہ اس کی پوری طرح مجاز ہے۔ کوئی ولی اس کے آڑے نہیں آسکتا۔ لیکن لگروہ کفائت کا لحاظ نہیں رکھتی تو یہ معروف کے خلاف ہوگا۔ اور ایسی حالت میں اس کے سرپرست کا یہ حق ہی نہیں بلکہ آیت کے ابتدائی الفاظ ”لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ“ کی روشنی میں اس کی ذمہ داری بھی ہوگی کہ وہ معاملے میں مداخلت کرے، اور ایسا نکاح ہونے نہ دے، اور اگر ہو گیا ہو تو عدالت مجاز کے ذریعہ اسے فسخ کرادے۔ اور یہی وہ بات ہے جو حنفیہ نے کہی ہے۔

یہاں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ زیر بحث آیت میں جن عورتوں کا تذکرہ ہے وہ ثقیبہ عورتیں ہیں نہ کہ باکرہ۔ اس سے باکرہ کے نکاح کے سلسلے میں ”معروف“ کی پابندی کی، اور سرپرستوں کے حق ولایت کی کچھ اور زیادہ ہی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔ یہ اس لئے کہ جب ثقیبہ کو بھی، جو بالعموم معاملہ فہم اور پختہ کار ہوتی ہے، اپنے نکاح کے معاملے میں ”معروف“ کا پابند ٹھہرایا گیا ہے تو باکرہ کے لئے، جو نسبت کم فہم اور نا پختہ کار ہی نہیں، عموماً جذباتی اور بھولی

بھی ہوتی ہے، اس پابندی کی اہمیت اور ضرورت قدرتی طور پر زیادہ ہونی چاہیئے۔

عورتوں کے نکاح کے معاملے میں ان کے سرپرستوں کو ولایت اور مداخلت کا یہ جو حق دیا گیا ہے، اسے ان کی آزادی رائے اور آزادی عمل کی نفی قرار دینا صحیح نہ ہوگا۔

یہ اس لئے کہ سرپرستوں کے اس حق ولایت کے باوجود اپنے معاملہ نکاح کی اصل مالک بنیادی طور پر وہ خود ہی رہتی ہیں، کیونکہ یہ سرپرست اسکا نکاح وہیں کرنے کے پابند ہیں جہاں کے لئے ان کی اپنی رضا مندی اور اجازت انہیں مل گئی ہو۔ حق ولایت کا مدعا اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا کہ اگر کوئی عورت ’معروف کو نظر انداز کر کے کسی غیر کفو سے نکاح کرنا چاہے تو اس کے سرپرست ایسا نہ ہونے دیں، گویا اس حق ولایت کی حیثیت عورت کو اس کے اپنے حق آزادی کے غلط اور ناقص اندیشہ استعمال سے محفوظ رکھنے کی صرف ایک تدبیر کی ہے۔ یہ اس لئے کہ عورت، بالخصوص نو عمر دوشیزہ عام طور سے نا تجربہ کار، کم اندیش اور جذباتی ہوتی ہے۔ اس کے بارے میں اس بات کا خاصا امکان ہوتا ہے کہ جذبات کی رو میں بہ کر وہ اپنی آئندہ کی پوری زندگی کے لیے ایسا انتخاب کر لے سکتی ہے جس میں زندگی کے ٹھوس حقائق اور اہم مصالح نظر انداز ہو گئے ہوں، اور اس کے نتیجے میں اس کا مستقبل تاریک ہو کر رہ جانے والا ہو۔ اس حقیقت کے پیش نظر یہ عورت کی عین اپنی ہی بہبود کا تقاضا ہے کہ اس کے نکاح کے معاملے میں اس کے پختہ اور دور اندیش سرپرستوں کی صوابدید

کو بھی ایک حد تک مداخلت کا حق دار تسلیم کیا جائے۔ تاکہ اگر وہ کوئی نامناسب اور مضرت رساں قدم اٹھا رہی ہو تو وہ اُسے اس سے باز رکھ سکیں، اور اس طرح وہ اپنی اس عزیزہ کے لئے، جس کو انہوں نے اپنی آغوش شفقت میں رکھ کر اتنے دنوں تک پالا پوسا ہے، ایک محفوظ اور کامیاب مستقبل کی تلاش کے اس اہم ترین معاملے میں بھی اس کی خیر خواہانہ رہنمائی اور مشفقانہ خبر گیری کا تقاضا پورا کر دیں۔

دوسری طرف خود سرپرستوں کا اپنا بھی ایک مفاد اس حق ولایت سے وابستہ ہے، اور یہ مفاد بھی ایسا ہے جس کی اہمیت کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ یہ صحیح ہے کہ عورت کے نکاح کا معاملہ اس کا اپنا ایک ذاتی معاملہ ہے، لیکن حقیقت یہ بھی ہے کہ یہ اُس کا ایسا ذاتی معاملہ ہرگز نہیں ہے۔ جس سے اس کے قریب ترین اہل خاندان کو بھی کوئی سروکار نہ ہو۔ اور چاہے جس شکل میں بھی وہ انجام پا جائے اس کا ان فطری جذبات، معاشرتی مصالح اور خاندانی وقار پر کوئی اثر نہ پڑتا ہو۔ عورت اگر کسی ایسے شخص سے نکاح کرنا چاہتی ہو جو اچھی شہرت نہ رکھتا ہو، یا دین بیزار ہو، یا اس کا کفو نہ ہو تو ممکن نہیں کہ یہ بات اس کے خاندان والوں کے لئے باعث تنگ اور موجب اضطراب ثابت نہ ہو، اور انکا وقار مجروح ہوئے بغیر رہ جائے۔ اور جب ایسا ہونا ناگزیر ہے تو یہ بھی کچھ بعید نہیں کہ اس کے نتیجے میں آگے چل کر بعض نزاکتیں اور پریشان کن مسائل بھی پیدا ہو رہیں۔ ظاہر ہے کہ معاملہ کا یہ پہلو کچھ کم اہم نہیں ہے اور اس کا بھی تقاضا تھا کہ سرپرستوں کو مناسب حدود کے اندر مداخلت کا حق ضرور دیا جاتا جن

لوگوں نے اپنی لڑکی یا بہن یا کسی اور عزیزہ کی پرورش اور تعلیم و تربیت پر ساہا سال تک اپنی بہترین توجہات اور توانائیاں صرف کی ہوں، انسانی شرافت، اخلاق اور حق و انصاف کو ان کا اس پر اتنا حق تو تسلیم ہی کرنا چاہیے کہ وہ بچتے چلاتے ان کے لئے تنگ و مار کا موجب نہ بن جائے اور اپنی آزاد روی کے پندار میں ان کے دلوں کو زخمی کر کے نہ رکھ دے۔ ممکن ہے کہ اسلام سے مختلف مزاج رکھنے والا کوئی معاشرہ اس تقاضائے انسانیت کو کوئی وزن نہ دے، مگر جس معاشرے کی تشکیل اسلامی اصول و اقدار پر ہوئی ہو اس کے مزاج سے یہ بات کسی طرح میل کھا ہی نہیں سکتی کہ وہ اتنے اہم اخلاقی تقاضے کی طرف سے آنکھیں بند کر لے۔

ان دو گونہ وجوہ کی بنا پر اگر اسلام نے عورتوں کے نکاح کے معاملے کو کلیتہً انہی پر موقوف نہیں رکھا ہے، بلکہ ان کی اصل آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے ان کے سرپرستوں کو بھی اس میں ایک حد تک دخل رکھنے کا حقدار ٹھہرایا ہے، تو اُسے ایسا کرنا ہی چاہیے تھا۔

۴۔ نابالغوں کا نکاح

نکاح کی عام عمر

نکاح کا تصور اور بلوغ کا تصور، دونوں کچھ لازم و ملزوم سے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بلوغ ہی کو نکاح کی عام عمر کہا جاتا ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ اسلام کو اس معروف حقیقت سے اختلاف ہوتا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن حکیم جب نکاح

کامیابی انداز میں تذکرہ کرتے ہیں تو اس کے ذہن میں نکاح کی عمر کا یہی تصور ہوتا ہے۔ مثلاً:-

وَابْتَلُوا الْيَتَامَىٰ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ..... الخ

(سورہ نساء آیت ۶)

”یتیموں کو آزما کر دیکھتے رہو، یہاں تک کہ وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں

..... الخ“

معلوم ہوا کہ قرآن کے نزدیک بھی نکاح کی کوئی عمر ہوا کرتی ہے، جو ظاہر ہے کہ بلوغ ہی کی عمر ہو سکتی ہے۔ اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:-

مَنْ دُلِدَ لَهَا وَلَدٌ فَلْيُحْسِنِ اسْمَهُ وَآدَبَهُ فَإِذَا بَلَغَ

فَلْيُزَوِّجْهُ۔ (مشکوٰۃ)

”جسے اللہ کوئی اولاد دے۔ اُسے چاہیے کہ اس کا اچھا سا نام

رکھے۔ اور اُسے حسنِ ادب سکھائے، پھر جب وہ بالغ ہو جائے تو اس کا

نکاح کر دے۔“

اس ارشادِ نبویؐ نے بالکل کھول کر بتا دیا کہ بلوغ ہی نکاح کی عمر کا عام اور معروف وقت ہوا کرتا ہے۔ پس یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ اسلام بھی نکاح کی عام عمر بلوغ ہی کو قرار دیتا ہے۔

نابالغوں کے نکاح کی اجازت

لیکن ساتھ ہی حقیقت یہ بھی ہے کہ اسلام اس معاملہ میں اسی حد پر رُک

جاتا ہے، آگے بڑھ کر یہ نہیں کہتا کہ نکاح کی قانونی عمر بھی یہی ہے۔ چنانچہ کتاب و سنت میں کہیں اشارہ بھی یہ ہدایت نہیں ملتی کہ نکاح بالغ ہو جانے کے بعد ہی کیا جاسکتا ہے، اس سے پہلے نہیں۔ اس لئے ایسا سمجھنا بالکل صحیح ہو گا کہ اسلام نے نابالغوں کے نکاح کی قانونی طور پر ممانعت نہیں کی ہے، بلکہ یہ گنجائش رکھی ہے کہ بوقت ضرورت بلوغ سے پہلے بھی نکاح کیا جاسکتا ہے۔

پھر اس گنجائش کا ثبوت اس خالص قانونی استنباط ہی سے نہیں ملتا، بلکہ اس کے حق میں قرآن کریم، اسوۂ رسولؐ اور اعلیٰ صحابہؓ، سب کی صریح یا تقریباً صریح قسم کی شہادتیں بھی موجود ہیں۔ سب سے پہلے قرآن کی اس آیت پر نظر ڈالیے۔

وَالَّذِي يَدِينُ مِنَ الْمُحْضِنِ مِنْ نِسَاءِ كُورَانِ اُرْتَبْتُمْ
قَعْدًا تَهْتِ ثَلَاثًا اَشْهُرًا وَالَّذِي لَعُوْ بِحُضْنِ - (طلاق، ۴)
”تمہاری جن عورتوں کو ایام آنے کی امید نہ رہ گئی ہو، اگر تیس شہ
ہو تو، اُن کی عدت تین مہینے ہے، اور ان کی بھی جنہیں ابھی ایام آئے
ہی نہ ہوں۔“

ظاہر ہے کہ ”عدت“ کا سوال طلاق یا بیوگی کے بعد، اور طلاق یا بیوگی کا سوال نکاح کے بعد ہی پیدا ہو سکتا ہے۔ اس لئے قرآن حکیم اگر ایسی عورتوں (یعنی لڑکیوں) کی بھی عدت کا حکم بیان فرما رہا ہے جنہیں ابھی ایام آئے ہی نہ ہوں تو اس سے صاف طور سے لازم آتا ہے کہ مسلم معاشرے میں نابالغ لڑکیوں کے نکاح کا چلن موجود تھا اور قرآن مجید نے اُسے نہ صرف یہ کہ

بند نہیں کیا بلکہ اس کے سلسلے میں عدت کا حکم بیان فرما کر اس کے جواز کی توثیق بھی فرمادی۔

جہاں تک اسوۂ رسولؐ کا تعلق ہے، دنیا جانتی ہے کہ آپؐ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے جس وقت نکاح کیا تھا اس وقت وہ بالغ نہیں تھیں چنانچہ اسی بنا پر کہ حضرت ابو بکرؓ نے اپنی ان نابالغ صاحب زادی کو آپؐ کے نکاح میں دے دیا تھا، پوری اُمت کا اس بات پر اجماع ہے کہ باپ اپنی نابالغ لڑکی کا نکاح کر دے سکتا ہے۔^۱

رہا عمل صحابہؓ کا معاملہ، تو سورۂ طلاق کی مذکورہ بالا آیت میں اسکا ثبوت بھی موجود ہے۔ کیونکہ نابالغ لڑکیوں کے بارے میں عدت کا حکم بیان کئے جانے کے معنی ہی یہ ہیں کہ دورِ نبوتؐ کے مسلمان ایسی لڑکیوں سے بھی نکاح کیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ حضرت عائشہؓ کے اس بیان میں اس امر واقعی کی پوری صراحت پائی جاتی ہے جو آپؐ نے سورۂ نساء کی آیت (۳) کی تفسیر کے ضمن دیا ہے۔ آپؐ فرماتی ہیں کہ ”لوگ ان یتیم لڑکیوں سے جو ان کے سرپرستی میں آچکی ہوتی تھیں، تھوڑے سے مہر پر شادیاں کر لیا کرتے تھے، ظاہر ہے کہ یتیم نابالغ ہی ہوتا ہے، بالغ نہیں ہوتا۔ اس لئے لوگوں کا یتیم لڑکیوں سے نکاح کرنا یہی معنی رکھتا ہے کہ صحابہؓ نابالغ لڑکیوں

۱۔ اجماع المسلمون علی جواز تزویج بنت البکر الصغیرۃ (شرح مسلم للنووی)

سے نکاح کیا کرتے تھے۔

ان سارے دلائل کے ہوتے ہوئے ناہالغوں کے نکاح کے شرعی جواز میں کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ ایک دوسرے درجہ کے فقیہہ ابن شبرمہ کے سوا سارے ائمہ مجتہدین اور علماء اس کے جواز پر متفق ہیں۔^۱

مصالح

اس اجازت کی وجہ زندگی کے کچھ ٹھوس حقائق ہیں۔ کچھ عملی مشکلات اور مسائل معاشرے میں ایسے رونما ہوتے رہتے ہیں جن کا تقاضا یہی تھا کہ بلوغ کو نکاح کا عام اور فطری وقت قرار دینے کے باوجود اس سے پہلے بھی نکاح کی اجازت باقی رکھی جاتی۔ ورنہ مسلم معاشرے کو یا تو ان مشکلات کا کوئی عملی حل نہ مل پاتا، یا پھر اُسے بعض اہم اخلاقی اور تہذیبی قدروں کی پامالی برداشت کرنے پر مجبور رہنا پڑتا۔

مثال کے طور پر ایک غریب شخص ہے، اسے اپنی لڑکی کے لیے اس وقت ایک اچھا اور موزوں رشتہ مل رہا ہے۔ اس واقعی اندیشے کے پیش نظر، کہ کل کلاں کو اس کی غربت کے باعث ایسا رشتہ نہ مل سکے گا اور اگر ملے گا بھی تو وہ اتنا گراں ہوگا کہ اس کی قیمت، کا ادا کرنا اُس کے بس سے باہر ہوگا، اس کی مصلحت کا تقاضا یقیناً یہی ہوگا کہ وہ اس رشتہ کو منظور کر لے۔ اور کم عمری کے باوجود لڑکی کا نکاح کر دے۔ ورنہ نہیں کہا جاسکتا

کہ آگے چل کر انہیں کیسی پریشانیوں اور بد بختیوں سے دوچار ہونا پڑ جائیگا
 اسی طرح ایک اور شخص کو لیجئے، جو غریب نہیں بلکہ مال دار ہے، لیکن
 بیماریوں کی گرفت میں جکڑا ہوا ہے اور نہیں معلوم کہ اس کی زندگی کا چرل و گب
 گل ہو جائے۔ اس کے دو ایک چھوٹی لڑکیاں ہیں۔ اس کے قریبی اعزہ میں ایسے
 فرض شناس اور ہمدرد و مخلص افراد موجود نہیں۔ جن کے بارے میں اسے
 توقع ہو کہ اگر وہ مر گیا تو یہ لوگ اس کی قیم لڑکیوں کی پرورش و پرداخت کا،
 اور پھر ان کے لئے اچھے رشتوں کی تلاش کا بوجھ اٹھالیں گے۔ اس کے بخلاف
 تقریباً یقین کی حد تک اسے اس بات کا اندیشہ ہے کہ میری آنکھیں بند ہوتے
 ہی میرے اعزہ و اقارب میری جائداد پر قبضہ جمالیں گے اور میری بے کس
 بچیوں کو یا تو بے التفاتیوں اور محرومیوں کی بھینٹ چڑھادیں گے یا ان کے
 حصے کے مال و جائداد کے لالچ میں انہیں اپنے ہی ناہنجار لڑکوں کے ساتھ بانٹ
 دیں گے۔ ہر ہوش مند آدمی کی رائے اس شخص کے بارے میں یقیناً یہی ہو
 گی کہ لڑکیوں کی کم سنی کے باوجود اسے مناسب رشتے تلاش کر کے ان کا جلد سے
 جلد عقد کر ڈالنا چاہیے۔

ایک مثال لڑکوں کے سلسلے کی بھی لیجئے۔ ایک لڑکا ہے، جو بے توابھی
 کم عمر اور نابالغ ہی، مگر ناشائستہ اور آوارہ ساتھیوں کے زرخے میں کچھ اس طرح
 گھبرا ہوا ہے کہ بلوغ کی منزل آتے ہی اس کے بدکاری کی راہ چل پڑنے کا وہی
 اندیشہ ہے۔ ایسے لڑکے کے ”مسلمان“ باپ کا فرض، دوسرے فرائض کے
 ساتھ، بلاشبہ یہ بھی ہوگا کہ وہ اپنے اخلاقی بے راہ روی کی زد پر آنے ہوئے

نخت جگر کے لئے ابھی سے نکاح کی پناہ گاہ مہیا کرے۔

یہ چند صورتیں بطور مثال پیش کی گئیں۔ جو شخص بھی حالات پر نظر رکھتا ہو گا وہ اس بات سے اتفاق کرے گا کہ یہ صورتیں بہت کم پیش آنے والی تو ضرور ہیں لیکن بالکل ہی شاذ و نادر قسم کی بھی نہیں ہیں۔ اس لئے اس طرح کی مشکلات کو، جن کا اوپر تذکرہ کیا گیا ہے، یہ کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ یہ بالکل اتفاقی صورتیں ہیں، کوئی عام معاشرتی مسئلہ نہیں ہیں۔ اگر ایک فی ہزار اشخاص کو بھی اس طرح کے حالات سے سابقہ پیش آتا رہتا ہو تو ایک عملی نظام اور اچھے قانون کا فرض ہے کہ ان کا بھی کوئی کامیاب حل اس کے اندر ضرور موجود ہو، چونکہ یہ کامیاب حل عملی نکاح کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا اس لئے قانون کو نابالغوں کے نکاح کا دروازہ بند نہ رکھنا چاہیے، بلکہ معاشرے کی عملی مشکلات اور مصالح کو پوری طرح پیش نظر رکھتے ہوئے اُسے کھلا ہی رکھنا چاہیے۔

اس سلسلے میں یہ عذر یا اعتراض کوئی معنی نہیں رکھتا کہ لوگ اس اجازت کا غلط استعمال کرتے ہیں اور کبھی واقعی ضرورت اور مصلحت کے بغیر بھی بچوں کی شادیاں کر دیا کرتے ہیں۔ یہ قانون کے نقص کی نہیں، قانون کے استعمال کے نقص کی بات ہے، اور کبھی قانون کے غلط استعمال کا علاج یہ نہیں ہوتا کہ اس قانون ہی کو ختم کر دیا جائے، بلکہ یہ ہوتا ہے کہ تعلیم و تربیت کے ذریعہ لوگوں

کی ذہنی اصلاح کی جائے
نکاح کے انعقاد کی عملی شکل

جہاں تک نابالغوں کے نکاح کی عملی شکل کا سوال ہے، تو ظاہر ہے کہ وہ

اپنا نکاح خود نہیں کر سکتے، کیونکہ اپنے شعور کی خامی اور فہم کی نارسائی کے باعث وہ اس کے اہل ہی نہیں ہوتے کہ نکاح جیسے اہم معاملے کو، اس کے مختلف پہلوؤں پر نظر رکھ کر، بطور خود انجام دے سکیں۔ اسلامی قانون نے تو، بیساکہ ابھی معلوم ہو چکا، اس بارے میں مکمل اور کئی اعتماد سن بلوغ کو پہنچ چکنے والی لڑکیوں، حتیٰ کہ بڑی عمر کی عورتوں پر بھی نہیں کیا ہے، اور ان کی رائے اور انتخاب کے سلسلے میں ان کے سرپرستوں کی موافقت یا توثیق بھی کسی نہ کسی حد تک ضروری سمجھی ہے۔ پھر کسی نابالغ کی رائے اور انتخاب کا اس سلسلے میں کوئی سوال ہی کہاں پیدا ہو سکتا ہے؟ غرض کوئی نابالغ اپنا نکاح خود نہیں کر سکتا، یہ کام اس کا شرعی ولی انجام دے گا۔ وہی حالات اور مصالح پر نظر ڈال کر اس کا نکاح کر دینے کا فیصلہ کرے گا، وہی رشتے کا انتخاب کرے گا، حتیٰ کہ وہی اس کی جانب سے ایجاب و قبول بھی کرے گا۔

’شرعی ولی‘ ہونے کا حق سب سے پہلے باپ کو حاصل ہوتا ہے وہ اگر نہ ہو تو دادا کو، دادا بھی نہ ہو تو پھر اس شخص کو یہ حق حاصل ہوگا، جو اس نابالغ کے موجودہ عقبات (پدری اقرباء) میں سے سب سے قریبی عصبہ ہو۔ اگر نزدیک یا دور کا کوئی بھی عصبہ موجود نہ ہو تو پھر موجود ذوی الارحام (مادری اقرباء) میں سے اس کا جو سب سے قریب کا رشتہ دار ہوگا۔ اس کی طرف یہ حق منتقل ہو جائے گا۔ اور اگر ذوی الارحام میں سے بھی کوئی موجود نہ ہو تو پھر ’سلطان‘ (اسلامی حکومت) اس حق کا مالک قرار پایا جائے گا۔

لے یہ سب کچھ حنفی مسلک کی رو سے ہے، جو کہ ہمارے ملک میں عام طور (بقیہ ص ۶۳ پر)

بلوغ کے بعد فسخ نکاح کا اختیار

اگر کسی نابالغ لڑکے یا لڑکی کا نکاح اس کے شرعی ولی نے اپنی سوا بدید کے مطابق کر دیا ہو تو یہ نکاح اس کے بالغ ہو جانے کے عین قبل تک تو ضرور لازم رہے گا، لیکن اس کے بعد معاملے کی نوعیت بدل جائے گی، یعنی اب اس نکاح کا برقرار رہنا اس لڑکے یا لڑکی کی اپنی رضا اور منظوری پر موقوف ہو جائے گا۔ اگر وہ چاہیں گے تو اسے اپنی رضا مندی دے کر بدستور برقرار رکھیں گے، ورنہ قاضی (شرعی عدالت) سے رجوع ہو کر اُسے فسخ (کالعدم) کرا لیں گے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ اس نکاح کے بارے میں بھی اب حق خود اختیاری کا وہ بنیادی اصول زیر عمل آجائے گا جس پر اس سے پہلے، نکاح کے منعقد ہونے کے وقت، اس لئے عمل نہیں ہو سکا تھا۔ کہ صاحب معاملہ کم سن اور نابالغ ہونے کے باعث اس کا اہل ہی نہ تھا، یہ کم سنی و نابالغی اس کے لئے اس حق کے استعمال کر سکنے سے مانع بنی ہوئی

(بقیہ ص ۶۲ کا) سے رائج ہے۔ دوسرے آئمہ کا مسلک اس سے بہت کچھ مختلف ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک نابالغوں کی شادی کر دینے کا یہ اجباری حق صرف باپ اور دادا کو حاصل ہے امام مالک کے نزدیک صرف باپ کو، اور باپ کی موت کے بعد اس کی وصی کو حاصل ہے۔ اچھے علاوہ اور کوئی بھی شخص، خواہ وہ کتنا ہی قریبی عزیز کیوں نہ ہو، یہ حق نہیں رکھتا۔ تھوڑے سے فرق کیساتھ ہی رائے امام احمد بن حنبل کی بھی ہے ان سب حضرات کا کہنا یہ ہے کہ باپ اور دادا یا باپ اور وصی کی عدم موجودگی میں یہ حق سلطان (اسلامی حکومت) کو حاصل ہو جائیگا۔ (کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۴)

تھی۔ اب جب کہ بلوغ کا وقت آگیا تو یہ مانع جاتا رہا، اس لئے حق خود اختیاری سے کام لیتے ہوئے وہ اپنے نکاح کے برقرار رکھنے یا نہ رکھنے کا جو چاہے فیصلہ صادر کر سکتا ہے، فقہ کی اصطلاح میں اس اختیار کو ”خیارِ بلوغ“ کہتے ہیں۔

لیکن علماء کے نزدیک یہاں ایک استثناء بھی ہے، اور وہ یہ کہ اگر نابالغ کا نکاح اس کے باپ یا دادا نے کیا ہو۔ تو پھر بالغ ہو جانے پر اُسے یہ خیارِ بلوغ حاصل نہ ہوگا، اور وہ اس نکاح کو اپنے لئے ناپسندیدہ قرار دے کر قاضی سے اُسے فسخ نہ کرا سکے گا۔ باپ یا دادا کا کیا ہوا نکاح ویسا ہی قطعی اور ناقابلِ فسخ ہوگا۔ جیسا کہ کسی بالغ کا خود اپنا کیا ہوا نکاح قطعی اور ناقابلِ فسخ ہوتا ہے۔ البتہ یہ استثناء دو شرطوں کے ساتھ مشروط ہے۔ ایک یہ کہ نکاح کر دینے والا شخص (خواہ وہ باپ ہو خواہ دادا) اب تک اس بات کے لئے مشہور نہ رہا ہو کہ وہ ”سَبَّحُ الْاِخْتِیَارُ“ ہے۔ یعنی وہ معاملات کے سلسلے میں بے احتیاطی سے کام لیتا اور اپنے اختیارات کو غلط طریقے سے استعمال کرتا ہے، دوسری بات یہ کہ وہ نکاح کے وقت نشہ میں نہ رہا ہو، جس کے نتیجے میں اس نے لڑکی کا نکاح مہر مثل سے کم مہر پر، یا کسی فاسق سے، یا غیر کفو سے کر ڈالا ہو۔

خیارِ بلوغ کے بارے میں اس استثناء کی بنیاد کسی آیت یا کسی صحیح حدیث

یا کسی مسئلہ شرعی اصول پر نہیں ہے۔ اس کا تمام ترمدار صرف اس خیال پر ہے کہ باپ اور دادا ایک طرف تو اپنی اولاد کے حق میں انتہائی شفقت اور سچے خیر خواہ ہوتے ہیں، دوسری طرف وہ جہاندیدہ، پختہ کار اور صاحب نظر بھی ہوتے ہیں، اس لئے ان سے تو قہم ہی رکھی جاسکتی ہے کہ اس کے نکاح کے سلسلے میں، دوسرے لفظوں میں اپنے لخت جگر کے مستقبل کے بارے میں یہ اہم ترین فیصلہ کرتے وقت، انہوں نے کسی کم اندیشی اور کوتاہ نظری سے کام نہ لیا ہوگا اور مخلصانہ و خیر خواہانہ ذمہ داری کا حق پوری طرح ادا کر دیا ہوگا۔ بلاشبہ اس خیال میں خامسا وزن ہے، لیکن یہ وزن اتنا زیادہ بھی نہیں ہے کہ اس خیال یا رائے کو ایک مسئلہ اور دائمی کلیہ کی حیثیت سے تسلیم کر لیا جائے۔ کم از کم آج کے دور کا تجربہ اور مشاہدہ تو اس نظریہ کی پوری پوری تائید نہیں کرتا۔ زوال کے مارے ہوئے مسلم معاشرے میں کتنے ہی افراد ایسے مل سکتے ہیں جو اپنی نابالغ لڑکی کو، نکاح کے نام پر، فی الواقع فروخت کر دیتے ہیں۔

پھر اس معاملے کا ایک خاص پہلو اور بھی ہے جسے نظر انداز نہ کیا جانا چاہیے، اور وہ یہ کہ سن رسیدہ سرپرستوں اور نوخیز اولاد دونوں کی پسند کا معیار اور انتخاب کا مدار کچھ نہ کچھ مختلف بھی ہو سکتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ نابالغ اولاد کے نکاح کا مسئلہ طے کرتے وقت باپ دادا اپنی نگاہ میں اہمیت

رکھنے والی باتوں کا پورا پورا لحاظ رکھیں گے، لیکن نکاح کے معاملے میں وہی بائیں سب کچھ نہیں ہوا کرتیں۔ جن کو بڑے بڑے اہم اور ضروری قرار دیں، بلکہ کچھ چیزیں اور بھی ہوتی ہیں۔ جن پر اُن کی نگاہ یا تو پڑ ہی نہیں سکتی یا اگر پڑے گی بھی تو ان کی عملی اہمیت کا کما حقہ احساس نہ کر سکے گی، ان کا پورا پورا احساس بلوغ کو پہنچنے کے بعد صرف متعلقہ نوجوان ہی کو ہو سکے گا۔ بالغ ہونے پر اس کا مزاج، اس کا ذوق، اس کی پسند، اس کی ترجیحات اور اس کے مخصوص جذبات کیا ہوں گے، آخر دوسرے لوگ اُن کا اندازہ اور لحاظ پہلے سے کیسے کر لے سکتے ہیں؟ حالانکہ ازدواجی زندگی کے کامیاب ثابت ہونے کے لیے ان باتوں کا ملحوظ رکھا جانا بھی ضروری ہے۔

ان دونوں وجوہ سے مناسب یہی ہے کہ مذکورہ بالا استثناء پر اصرار نہ کیا جائے اور ان لڑکوں یا لڑکیوں کے لیے بھی خیارِ بلوغ کا قانونی حق تسلیم کر لیا جائے۔ جن کا نکاح ان کی نابالغی میں، ان کے باپ یا دادا نے کر دیا ہو۔ شریعت کے اصولوں سے یہ بات ہم آہنگ ہی ہوگی، متصادم نہ ہوگی۔ نکاح کے بارے میں شریعت کا بنیادی اصول ”جبر“ کا نہیں۔ ”اختیار“ کل ہے۔

۵۔ کفائت (برابری)

مفہوم اور مقصد

نکاح کے معاملے میں شریعت ایک بات یہ بھی چاہتی ہے کہ ”کفائت“

کا لحاظ رکھا جائے۔ کفائت کے لفظی معنی مساوات اور برابری کے ہیں۔ شرعی اصطلاح کی حیثیت سے اس کا مفہوم یہ ہے کہ شوہر چند خاص اُمور میں عورت کے برابر کا ہو۔

اس ہدایت کی بنیاد تمام تر عملی مصلحت پر ہے، نہ کہ کسی سماجی اصول پر۔ اس کا مدعا صرف یہ ہے کہ منعقد ہونے والا ازدواجی رشتہ انمل اور بے جوڑ نہ ہو، تاکہ نکاح کے شرعی مقاصد کو زیادہ سے زیادہ تحفظ حاصل رہے اور کوئی ایسی چیز جانتے بوجھتے درمیان میں مائل نہ کر لی جائے جس سے اس رشتہ کے استحکام یا اس کے مقاصد کو نقصان پہنچ جانے کا اندیشہ ہو۔ مرد کا عودت سے پست مرتبہ ہونا یہ اندیشہ بہر حال رکھتا ہے۔ ایک طرف تو قیاس ہی نہیں مشاہدہ بھی بتاتا ہے کہ یہ نابرابری زوجین کے درمیان اُس گہرے ربط و اتصال کے پیدا ہونے میں رکاوٹ بن سکتی ہے۔ جو نکاح کے رشتے کی جان بھی ہوتا ہے اور اس کی ایک اہم غایت بھی۔ دوسری طرف ایسا رشتہ عورت کے خاندان والوں کے لئے تنگ باعث اور سوہان روح ثابت ہو سکتا ہے۔ جس کے نتیجے میں وہ دو خاندانوں کو جوڑنے کے بجائے اُلٹان کے مابین منافرت کی خلیج بن جائے گا۔ اس لئے، اور صرف اس کی لئے، شریعت نے مناسب سمجھا ہے کہ نکاح کرتے وقت کفائت کا لحاظ رکھا جائے، تاکہ یہ رشتہ اس قسم کے افسوس ناک حشر سے محفوظ رہے۔

یہ کفائت عورت اور اس کے شرعی ولی، دونوں کا حق ہوتی ہے۔ یعنی اگر

ان میں سے کوئی ایک اُسے نظر انداز کر رہا ہو تو دوسرے کو حق ہو گا کہ اس پر معترض ہو اور ایسے نکاح کو منعقد نہ ہونے دے، اور اگر وہ منعقد ہو گیا ہو تو قاضی شرع سے رجوع کر کے اُسے فسخ کرادے۔
وہ امور جن میں کفائت مطلوب ہے

ان خاص امور میں سے، جن میں کفائت کا لحاظ رکھا جانا چاہیے، ایک چیز کی تو قرآن مجید اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے بخوبی تعین ہو جاتی ہے۔ اور وہ ہے تقویٰ اور نیک عمل۔ مثلاً ۱۔

إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ۔ (مجات، ۱۲)

”حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ باعزت

وہ ہے جو سب سے زیادہ تقویٰ رکھنے والا ہو۔“

لَا تَفْضَلْ لِعَرَبِيٍّ عَلَى عَجَبِيٍّ وَلَا لِعَجَبِيٍّ عَلَى عَرَبِيٍّ
وَلَا لِأَحْمَرَ عَلَى أَسْوَدَ وَلَا لِأَسْوَدَ عَلَى أَحْمَرَ إِلَّا بِالتَّقْوَى

(مسند احمد، جلد ۵ ص ۴۱۱)

”نہ کسی عربی کو کسی عجمی (غیر عربی) پر کوئی فضیلت حاصل ہے نہ کسی عجمی کو کسی عربی پر، نہ کوئی کالا کسی گورے پر کوئی برتری رکھتا ہے نہ کوئی گورا کسی کالے پر، سوائے تقویٰ کی بنا پر حاصل ہونی والی برتری کے۔“

إِذَا خُطِبَ إِلَيْكُم مِّن تَرَضُّوتٍ دِينًا وَخُلُقًا
فَرَوْحُوهُ إِلَّا تَفْعَلُوا تَكُنْ فِتْنَةً فِي الْأَرْضِ وَفَسَادٌ

عَرِيضٌ۔ (ترمذی، ج ۱ ص ۱۳۸)

”جب کوئی ایسا شخص تمہارے یہاں نکاح کا پیغام دے جس کی دینداری اور اخلاق پسندیدہ ہوں۔ تو اس کا اپنے یہاں رشتہ کر دو۔ اگر ایسا نہ کر دو گے تو معاشرے میں فتنہ اور سخت جھاڑ برپا ہو جائے گا۔“

تُشْكِعُ الْمَرْأَةَ لِأَرْبَعٍ لِمَالِهَا وَلِحَسَبِهَا وَ
لِجَمَالِهَا وَلِدِينِهَا فَاطْفُرُ بَنَاتِ الدِّينِ۔ (بخاری و مسلم
بحوالہ مشکوٰۃ کتاب النکاح)

”عورت سے نکاح چار چیزوں کو سامنے رکھ کر کیا جاتا ہے، اس کا مال، اس کی نسب و شرافت، اس کا حسن اور اس کا دین، تو تم دین والی عورت کو اپنے لیے منتخب کرو۔“

لِيَتَّخِذَ أَحَدُكُمْ..... زَوْجَةً مُؤْمِنَةً تَعِينُ
أَحَدَكُمْ عَلَى أَمْرِ الْآخِرَةِ۔ (ابن ماجہ، ابواب النکاح)

”تم میں سے ہر شخص کو..... ایسی صاحب ایمان بیوی کرنی چاہیے

جو آخرت کے معاملے میں اس کی مددگار بنے۔“

ان نصوص سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایک مومن کی نگاہ میں اصل اہمیت صرف نیکو کاری اور تقویٰ کی ہونی چاہیے، اس کے سوا اور کوئی چیز ایسی نہیں۔ جسے عزت اور عظمت کا حقیقی مدار قرار دیا جاسکے۔ اور آخری دونوں حدیثوں میں تو صراحتاً یہ ہدایت موجود ہے کہ نکاح کے لیے دین دار اور نیک سیرت عورت کا انتخاب کرنا چاہیے۔ جس کا مقتضا واضح طور پر یہ

بھی ہے کہ عورت کے لئے بھی شوہر کے انتخاب میں دین و تقویٰ کو سامنے رکھا جانا چاہیے۔

چونکہ قرآن اور حدیث میں اس طرح کے بے شمار ارشادات موجود ہیں اس لئے پوری اُمت کا اس پر اتفاق ہے کہ دین و تقویٰ کے لحاظ سے مرد کو عورت کے ہم پایہ ہونا چاہیے۔ باقی امور کے بارے میں چونکہ اللہ و رسولؐ کی کوئی صریح ہدایت موجود نہیں ہے اس لئے ان کے سلسلے میں علماء کی رائیں مختلف ہیں۔

حنفیہؒ کے نزدیک دین و تقویٰ کے علاوہ پانچ چیزیں اور ہیں، جن میں کفایت کا لحاظ رکھا جانا چاہیے۔ اور وہ یہ ہیں:-

۱۔ نسب، ۲۔ پیشہ، ۳۔ حریت (یعنی غلام نہ ہونا)، ۴۔ ماں، ۵۔ اسلام (یعنی مسلمان ہونے) کی قدامت۔

شوآفؒ کے نزدیک یہ صرف تین چیزیں ہیں: ۱۔ نسب، ۲۔ پیشہ، ۳۔ حریت۔

۱۔ بدایتہ المجتہد، جلد دوم ص ۱۵۔

۲۔ اگرچہ حدیث کی کتابوں میں بعض ایسی روایتیں موجود ہیں۔ جن سے اس بارے میں استدلال کیا جاتا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ روایتیں اتنی کمزور ہیں کہ اتنے اہم معاملے میں ان سے استدلال کرنا صحیح نہیں کہا جاسکتا۔

۳۔ کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ جلد چہارم ص ۵۴، ۵۵۔

غنبلیوں کے نزدیک ان کی تعداد چار ہے ۱۔ ۱۔ نسب، ۲۔ مال، ۳۔
صناعت، ۴۔ حریت۔

مالکیہ کے نزدیک دین و تقویٰ کے علاوہ صرف 'بے عیبی' کا ایک وصف
ایسا ہے جس میں کفائت مطلوب ہے۔
بعض لوگوں کے نزدیک دین و تقویٰ کے سوا اور کوئی چیز ایسی نہیں۔ جس
میں کفائت کو ملحوظ رکھنا شرعاً مطلوب ہو۔

اس اختلاف کی وجہ، جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا، یہ ہے کہ قرآن اور حدیث
کے اندر دین داری اور صلاح و تقویٰ کے سوا کسی اور وصف میں دو مین
کی ہم سری کی ضرورت کے متعلق اثباتی طور پر کچھ نہیں فرمایا گیا ہے۔ اس کے
بخلاف ترمذی شریف کی مذکورہ بالا حدیث (إِذَا خَطَبَ إِلَيْكُمْ خَلْقٌ)
تو اس امر کی ہدایت دیتی نظر آرہی ہے۔ کہ فی الواقع دین و تقویٰ اور حسن خلق
ہی ایک ایسی چیز ہے۔ جس پر ایک مسلمان کی نگاہ طلب پڑنی چاہیے، اس
کے ہوتے ہوئے اگر حسب نسب اور مال و دولت کو اہمیت دی گئی تو یہ
کوئی اچھی بات نہ ہوگی۔ اس حقیقت کی نشان دہی ایک اور روایت سے
بھی ہوتی ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ ابو ہند نامی ایک صحابی نے آنحضرت

۱۔ ۲۔ کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ جلد چہارم ص ۵۲، ۵۳۔

۳۔ بدایت المجتہد، جلد دوم ص ۱۶۔

صلی اللہ علیہ وسلم کے پھنسا لگایا۔ آپ نے (اُن کی مہارت فن وغیرہ کو دیکھ کر) فرمایا: ”اے بنی بیاضہ! ابو ہند کے یہاں رشتے دوستے دو بھی اور رشتے کرو بھی“ یہ معلوم رہے کہ بنی بیاضہ ایک معزز قبیلہ کا نام ہے اور ابو ہند جن کا نام یسار تھا، اس قبیلہ کے آزاد کردہ غلام تھے۔ لہذا آنحضرت کا یہ ارشاد اس امر کی دلیل ہے۔ کہ نکاح کے سلسلہ میں حسب و نسب کوئی اہمیت نہیں رکھتا اب جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ قرآن حکیم اور احادیث میں دین و تقویٰ کے سوا کسی اور چیز کی رعایت ملحوظ رکھنے کے بارے میں اثنائی طور پر کیوں کچھ نہیں فرمایا گیا ہے، تو ہر صاحب نظر کو خود محسوس کرنا چاہیے کہ حکمت اور مصلحت کا تقاضا یہی تھا۔ یہ اس لیے کہ کفایت کے مقصد و مقابلا کا حاصل ہونا جن امور میں زوجین کی ہم سر می کا طالب ہو سکتا ہے۔ وہ ہر زمانے اور ہر معاشرے میں یکساں نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ سماجی بلندی اور پستی کے تصورات وقت اور ماحول کے اختلاف کے ساتھ کچھ نہ کچھ ادلتے بدلتے رہتے ہیں۔ ایک دور یا ایک معاشرے میں اگر کسی خاص چیز کو سماجی طور پر عظمت کا نشان یا لارم سمجھ لیا گیا ہو تو عین ممکن ہے کہ آگے چل کر یا کسی دوسرے معاشرے میں، اس کی کوئی خاص اہمیت باقی نہ رہ گئی ہو۔ یہی حال سماجی پستی کی علامت سمجھی جانے والی باتوں کا بھی ہے۔ مثال کے طور پر ایک پیشہ کو اگر آج پست مانا جا رہا ہو تو کل اس کا شمار اچھے پیشوں میں ہو سکتا ہے

اس لئے کسی شے کے بارے میں بھی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ ہر جگہ اور ہمیشہ سماجی برتری کا ایک مسلمہ معیار بنی رہے گی۔ جب حقیقت واقعی یہ تھی تو کتنا غلط ہوتا اگر شریعت نے کچھ چیزوں کو نام زد کر دیا ہوتا اور نکاح کے وقت ان میں زوجین کی ہم سری ملحوظ رکھنے کی عام اور دائمی ہدایت دے دی ہوتی! یہ بات ایک طرف تو عزت و عظمت کے اسلامی تصور کے بھی خلاف ہوتی، دوسری طرف مقصد کفائت سے بھی پوری طرح ہم آہنگ نہ ہوتی۔ عزت و عظمت کے اسلامی تصور کے خلاف اس لئے ہوتی کہ شریعت نے جس چیز کو بھی کفائت کے سلسلے میں مراحت سے قابل لحاظ قرار دے دیا ہوتا وہ بالواسطہ شرف و عزت کا مدار بن جاتی۔ حالانکہ اسلام کی نظر میں دین اور تقویٰ کے سوا دوسری کوئی بھی چیز شرف و عزت کا مدار بالکل نہیں ہے۔ اسی طرح وہ مقصد کفائت سے ہم آہنگ اس لئے نہ ہوتی کہ اس ہدایت کے نتیجے میں بعض اوقات یا بعض معاشروں میں کچھ ایسی چیزوں میں بھی کفائت کا لحاظ رکھنا ضروری ہو جاتا۔ جن کی عملاً کوئی خاص ضرورت نہ ہوتی، جب کہ بعض معاشرے ایسے بھی ہوتے جن کے یہاں کچھ دوسری ہی چیزیں یہ مقام حاصل کئے ہوتیں، مگر چونکہ شریعت کی دی ہوئی فہرست میں وہ موجود نہ ہوتیں اس لئے جس کا جی چاہتا ان کا لحاظ رکھتا جس کا جی چاہتا نہ رکھتا۔ پہلی شکل میں لوگ بلا ضرورت کی بندش میں مبتلا ہو جاتے اور دوسری شکل میں بعض ان چیزوں کو بھی نظر انداز کر دیتے جن میں کفائت کا لحاظ رکھنا وقت کے معروف اور مصلحت کے پیش نظر ضروری یا مطلوب ہوتا، اور اس طرح نکاح کے قائم ہونے

والے رشتوں کو ناکامی کے خطرے میں ڈال دیا کرتے۔

ان وجوہ کی بنا پر عملی مصلحت اور حکمت کا تقاضا یہی تھا کہ دین و تقویٰ کے بارے میں تو ضرور صراحت کے ساتھ یہ ہدایت دے دی جاتی کہ اس میں کفایت کا لحاظ رکھا جائے، کیونکہ اس کی ضرورت اور اہمیت بذاتِ خود مُسلمہ اور قطعی تھی۔ مگر باقی چیزوں کو وقت کی ضرورت اور معاشرے کے معروف پر چھوڑ دیا جاتا، اور یہی شریعت نے کیلئے ہے۔

اس تفصیل سے یہ حقیقت بھی اچھی طرح نمایاں ہو جاتی ہے کہ کفایت کے باب میں دین و تقویٰ کی اہمیت تو مستقل بالذات اور حقیقی ہے۔ مگر باقی چیزوں کی وقتی اور اضافی ہے۔ پھر باقی چیزوں کی یہ 'اضافی اہمیت' تسلیم کرنے کا مطلب بھی یہ ہرگز نہیں ہے کہ اس طرح شریعت نے بلندی اور پستی کے رواجی معیاروں کو اپنی خاموش منظوری عطا کر دی ہے۔ اس کے بخلاف حقیقت یہی ہے کہ اس نے دین داری اور تقویٰ کے سوا کسی بھی دوسری چیز کو عزت و عظمت کا معیار تسلیم کرنے سے سختی کے ساتھ انکار کر رکھا ہے۔ جیسا کہ اوپر کتاب و سنت کے صریح نصوص سے واضح کیا جا چکا ہے۔ پس نکاح کے سلسلے میں اس نے دوسری چیزوں کی جو یہ اضافی اہمیت تسلیم کی ہے، اس تصور کے تحت ہرگز نہیں کی ہے کہ وہ بھی کسی عزت و عظمت کا مظہر ہیں۔ بلکہ صرف ایک عملی مشکل کے حل کی خاطر کی ہے۔ امر واقعی یہ ہے کہ ہر مسلم معاشرہ اتنا بلند اور صالح نہیں ہوتا کہ اس کے عام افراد نکاح کے رشتے قائم کرتے وقت دین و تقویٰ کے سوا کسی اور چیز کو کوئی

اہمیت ہی نہ دیں، نہ دولت کو، نہ حسب نسب کو، نہ پیشہ کو، نہ اود کسی شے کو۔ ایسی حالت میں اگر بے لاگ اور بے لچک اصول پسندی پر اصرار کرتے ہوئے یہ ہدایت دے دی گئی ہوتی کہ نکاح کے سلسلے میں صرف دین و تقویٰ ہی کو سامنے رکھا جائے اور دوسری کسی بھی چیز کو مطلق کوئی اہمیت نہ دی جائے تو انہیں کہا جاسکتا ہے کہ خیر القرون کے بعد مسلم معاشروں میں اس ہدایت کا کہاں تک عملی احترام ہو پاتا ہے اور اس کے نتیجے میں کتنی پیچیدگیاں پیدا ہوتی رہتیں؟۔ ایک عالم گیر، دائمی اور عملی شریعت ہونے کی بنا پر اسلام کے لئے یہ مناسب نہ تھا کہ انسانی زندگی کے ان تھوس حقائق کی طرف سے آنکھیں بند رکھتا۔ اس لئے اس نے حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے ان چیزوں میں بھی کفائت کا لحاظ رکھنے کی گنجائش خاموشی کے ساتھ تسلیم کر لی جن کی اس کی نگاہ میں اگرچہ فی نفسہ کوئی اہمیت نہ تھی مگر جن کے متعلق معلوم تھا کہ عام ذہنوں میں وہ خامی اہمیت حاصل کرتی ہیں گی۔ — تسلیم اس لئے کر لیا کہ نکاح کے رشتے جنہیں بہر حال قائم ہونے رہنا چاہیے، عملاً محال اور دشوار نہ ہو جائیں، یا منعقد ہو چکنے کے بعد زاکامی کے خطرے میں نہ پڑ جایا کریں۔

کفائت جواز نکاح کی لازمی شرط نہیں

کفائت صرف مطلوب ہے، جواز نکاح کی لازمی شرط نہیں ہے۔ یعنی اگر

لے شوائع اور بعض حنفی علماء کے نزدیک کفائت نکاح کے صحیح قرار پانے کے (بقیہ صفحہ ۷۶ پر)

کسی عورت نے کسی ایسے مرد سے نکاح کر لیا ہو، یا اُس کے سر پرست نے کر دیا ہو، جو اس کا کفو نہ ہو تو یہ نکاح بجائے خود ناجائز نہ ہوگا۔ البتہ پہلی شکل میں سر پرست کو، اور دوسری شکل میں خود عورت کو اس پر اعتراض کا حق حاصل ہوگا۔ اور وہ قاضی کی عدالت سے اس نکاح کو فسخ کرا سکیں گے گویا اگر عورت اور اس کے سر پرست، دونوں ہی کسی غیر کفو سے نکاح کرنے پر راضی ہو جائیں تو ایسا نکاح ہر حیثیت سے جائز اور صحیح قرار پائے گا۔

اس بات کا سب سے واضح ثبوت خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے عمل میں موجود ہے۔ آپ نے اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا نکاح، جو ظاہر ہے کہ سماجی حیثیت سے انتہائی اُونچے مقام کی مالک تھیں، حضرت زید رضی اللہ عنہ سے کر دیا تھا۔ جو ایک آزاد کردہ غلام ہو۔ نئے کے باعث سماجی طور پر صغیر پائیں میں اپنی جگہ رکھتے تھے۔ بعد میں یہ رشتہ برقرار نہ رہ سکا، اور حضرت زیدؓ نے بیوی کے احساس برتری اور عالی نسب کے منظر ہرے سے تنگ آکر انہیں علیحدہ کر دیا۔ یہ واقعہ دونوں ہی باتوں کا ثبوت ہے :- اس بات کا بھی کہ نکاح کے جواز میں سماجی مراتب کا فرق کوئی رکاوٹ نہیں بن سکتا، اور اس بات کا بھی کہ دین اور تقوٰے

(بقیہ ص ۷۵ کا) لئے ایک ضروری شرط ہے (کتاب الفقہ ۲ ص ۵۶) لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ انتہائی کمزور مسلک ہے۔

کے ماسوا بھی کچھ چیزیں ایسی ہو سکتی ہیں۔ جن میں مرد کی فرد تری ازدواجی پشتے کے لئے کامیابی سے ہم کنار ہونے میں عملار کاوٹ بن سکتی ہے۔ اس لئے علی ضرورت اور مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ ایسی چیزوں میں کفائت کا لحاظ رکھ کر نکاح کیا جائے۔

مرد کے لئے کفائت کا کوئی سوال نہیں

آخر میں یہ بات بھی جان لینا چاہیے۔ کہ کفائت کا سوال صرف عورت سے تعلق رکھتا ہے، مرد کے لئے کفائت کوئی مسئلہ نہیں۔ وہ جس سطح کی عورت سے چاہے نکاح کر سکتا ہے، خواہ وہ حسب نسب اور پیشہ وغیرہ کے اعتبار سے اس کے برابر کی ہو یا نہ ہو۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ نسب مرد ہی کے نام سے چلتا ہے اور نسل اسی کی طرف منسوب ہوتی ہے نہ کہ عورت کی طرف۔ اس لئے اگر مرد نے کسی کم تر حیثیت کی عورت سے شادی کر لی تو اس سے اولاد کے نسب و قار کو کوئی گزند نہیں پہنچ سکتا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ مرد عورت کی نہیں، بلکہ عورت مرد کی قوامیت (سربراہی) میں ہوتی ہے۔ اس لئے اس کی کوئی عرفی پستی مرد کے مرتبہ و مقام کو متاثر نہ کر سکے گی۔ اس کے برعکس مرد کی بلندی اس کی پستی کا حجاب بن جائے گی۔ چنانچہ سوسائٹی میں عورت کے مرتبہ و مقام کی تعیین بالعموم جن چیزوں سے ہوا کرتی ہے ان میں مرد کا سماجی مرتبہ بھی ایک اہم عنصر کی حیثیت رکھتا ہے۔

غرض وہ مصالح، جو عورت کے لئے مرد کی ہم سری کو ایک قابل لحاظ ضرورت قرار دیتے ہیں، مرد کے لئے عورت کی ہم سری کے طالب نہیں ہوتے،

یا بہت کم ہوتے ہیں۔ اس لئے بجا طور پر کفایت اس کے لئے کوئی مسئلہ نہیں ہوتی۔

۴۔ مہر

شرعی اہمیت

مہر اس مال کو یا مالیت رکھنے والی شے کو کہتے ہیں، جسے مرد کو، نکاح کے سلسلے میں عورت کو دینا ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں کئی مقامات پر اس کا حکم مذکور ہے۔ مثلاً

وَآتُوا النِّسَاءَ صَدُقَاتِهِنَّ نِعْلَةً۔ (نساء، ۴)

”اور ان عورتوں کو مہر دو، دینے کی طرح“

..... وَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ هُنَّ بِالنَّكَاحِ

۳ (نساء، ۲۵)

”..... اور انہیں دستور کے مطابق ان کے مہر دو“

نہ صرف یہ کہ مہر دینے کا حکم دیا گیا ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے اسے اپنا

عائد کیا ہوا فریضہ بھی فرمایا ہے۔

قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِي

اس مہر کی یہ تعریف احناف لے کی ہے۔ شوافع کے نزدیک مہر کا کوئی مالیت والی شے

ہونا ضروری نہیں۔ حق یہ ہے کہ احناف ہی کی بات صحیح ہے۔

أَزْوَاجِهِمْ..... (احزاب، ۵۰)

”ہمارے علم میں ہے وہ فریضہ جیسے ہم نے لوگوں پر ان کی بیویوں

کے سلسلے میں مائد کر رکھا ہے۔“

ان صریح احکام اور ارشادات کی بنا پر مہر کے شرعاً واجب اور ضروری ہونے میں تو کوئی کلام ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لئے اس کے وجوب پر سبھی متفق ہیں علامہ ابن رشد لکھتے ہیں۔ کہ مہر کے صحت نکاح کی شرط ہونے پر علماء کا اتفاق ہے۔ (اتفقوا علی ان شرط من شروط الصحت) یہ البتہ اس وجوب اور اس شرط کی قانونی نوعیت میں علماء کی دو الگ الگ رائیں ہیں :-

حنفیہ کہتے ہیں کہ مہر شرعاً واجب اور ضروری ہے۔ کوئی بھی اسے ساقط نہیں کر سکتا۔ حتیٰ کہ اگر کسی نے اس شرط کے ساتھ نکاح کر لیا ہو کہ وہ کوئی مہر نہ دے گا اور مہر کے بغیر ہی نکاح کر رہا ہے، اور عورت نے بھی اس شرط کو منظور کر لیا ہو تب بھی اس کی ادائیگی اپنی جگہ بدستور واجب اور ضروری ہے، اور مرد کی یہ شرط یکسر لغو اور غیر مؤثر قرار پائے گی۔ کیونکہ یہ مہر اللہ تعالیٰ کی طرف سے لازم ٹھیرایا ہوا فریضہ ہے، اس کا واجب اور ضروری ہونا کسی اور کی مرضی پر ہرگز موقوف نہیں ہے یہ

۱۔ بدایۃ المجتہد، جلد دوم ص ۱۶۔

۲۔ ہدایہ جلد دوم، باب المہر ص ۳۰۵۔

حنبلؒ علماء کی بھی یہی رائے ہے۔^{۱۵}

امام مالکؒ کے نزدیک مہر صرف واجب ہی نہیں۔ بلکہ عقدِ نکاح کے ارکان میں شامل ہے۔ یعنی نکاح کا نکاح ہونا جہاں کچھ اور باتوں پر موقوف ہے۔ وہیں مہر پر بھی موقوف ہے۔ اگر کسی نے مہر نہ دینے کی شرط کے ساتھ نکاح کیا تو یہ نکاح سرے سے جائز ہی نہ قرار پائے گا۔

قرآن حکیم نے مہر کے سلسلے میں جو ہدایات دی ہیں اُن کے الفاظ اور اندازِ بیان سے یہی دوسری رائے زیادہ قوی معلوم ہوتی ہے۔ علامہ ابن حجر شاریؒ نے اس بات پر اجماع نقل کیا ہے کہ ”مہر کے بغیر کسی عورت سے جنسی تعلق کا قائم کرنا جائز نہیں ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں بھی آتا ہے کہ جس نے کسی عورت سے نکاح مہر کے ساتھ تو کیا ہو مگر اس مہر کے ادا کرنے کا فی الواقع کوئی ارادہ نہ رکھتا ہو تو ایسا شخص زانی ہے۔“

اس مسئلے میں خود عورت کی رضامندی اور منظوری بھی کوئی فرق پیدا نہ کر سکے گی۔ کیونکہ مہر عورت کا حق ضرور ہے، مگر اس سے پہلے وہ شریعت کا ”حق“ ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی بھی شخص اپنے حق کو تو ساقط قرار دے سکتا ہے، مگر شریعت کے حق کو ساقط قرار نہیں دے سکتا۔ چنانچہ تمام علمائے اسلام کا

۱۵۔ کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ، جلد ۳، ص ۸۸، ۸۹۔

۱۶۔ ایضاً۔

۱۷۔ فتح الباری، جلد ۹، ص ۱۶۷۔

اس پر اتفاق ہے کہ مہر کو ساقط ٹھہرا لینے پر متعلقہ افراد (شوہر اور بیوی یا اس کے ولی) کا متفق اور رضا مند ہونا جائز نہیں ہے۔

یہاں یہ بات بھی جان لینی چاہیے کہ مہر کے واجب ہونے یا صحت نکاح کی شرط ہونے کے باوجود یہ ضروری نہیں کہ نکاح کے وقت ہی اسے ادا کر دیا جائے یا کم از کم یہ کہ اس کی تعیین اور ادائی بعد میں بھی کر لی جاسکتی ہے۔ یہ گنجائش یا اجازت قرآن کریم کے بعض ارشادات سے بالکل واضح طور پر نکلتی ہے۔ اور اس پر علماء کا اجماع ہے۔ اس اجازت کی وجہ یہ ہے کہ نکاح کے وقت مہر کا تذکرہ نہ آنے یا اس کی تعیین نہ ہونے سے اس کی ضرورت اور اہمیت پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ کیوں کہ وہ بجائے خود ایک لازمی اور قطعی فریضہ ہے۔ اس لئے نکاح کے موقع پر لفظوں میں اس کا تذکرہ اور تعیین نہ ہونے کے باوجود اصلاً اور معنی وہ مذکور اور متعین ہی ہوتا ہے۔

مہر کی مقدار کم سے کم بھی ہو سکتی ہے اور زیادہ سے زیادہ بھی۔ اس بارے میں علماء کا اختلاف ہے کہ کم سے کم مہر کیا اور کتنا ہو سکتا ہے مگر اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ اس کی کوئی آخری حد قانونی طور پر مقرر نہیں ہے زوجین جو

۱۔ بدایۃ المجتہد، جلد دوم ص ۱۶۔

۲۔ مثلاً سورہ بقرہ کی آیت ۲۳۶۔

۳۔ بدایۃ المجتہد، جلد دوم ص ۲۲۔

مہر چاہیں آپس میں مقرر کر لے سکتے ہیں۔ قانونِ شرع اس میں کوئی رکاوٹ نہ ڈالے گا۔ لیکن یہ صرف قانون کی بات ہے، شریعت کی نگاہ میں پسندیدہ بہر حال یہی ہے کہ اس معاملہ میں اعتدال کو ملحوظ رکھا جائے اور مہر اتنا ہی مقرر کیا جائے جو وقت کے معروف اور زوجین کے سماجی مرتبے اور معاشی حالات کے مطابق ہو، جیسا کہ سورۃ نسا کی مذکورہ آیت کے لفظ ”بِالْمَعْرُوفِ“ سے ظاہر ہوتا ہے۔ دورِ نبویؐ میں جب بعض لوگوں نے ”معروف“ کی سطح سے اونچے مہر مقرر کیئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حکماً روکا تو نہیں، لیکن ناپسندیدگی کا اظہار ضرور فرمایا۔

حیثیت اور مقاصد

مہر کی حیثیت بیادری طور پر ایک لازمی ہدیہ کی ہے، نہ کہ معاوضے کی۔ (جیسا کہ عام طور سے گمان کیا جاتا ہے)۔ اس حقیقت کا ثبوت خود اسی حکمِ شرع میں موجود ہے جو مہر کے واجب اور شرطِ نکاح ہونے کے بارے میں اُپر بیان کیا جا چکا ہے۔ ”قیمت“ اور ”معاوضہ“ ایسی چیزیں ہیں جنہیں صاحبِ معاملہ اپنی مرضی سے ساقط کر دینے کا پورا اختیار رکھتا ہے۔ وہ قیمت لئے بغیر بھی اپنی چیز کسی کو عطا کر سکتا ہے، یا اس سے فائدہ اٹھانے کی اجازت دے سکتا ہے۔ لیکن ہم دیکھ چکے ہیں کہ مہر کو ساقط ٹھیرا دینے کا اختیار خود عورت کو بھی نہیں ہے، اور جو نکاح مہر نہ دینے کی شرط کے ساتھ کیا جائے وہ ہر سے منعقد

ہی نہ ہوگا، یا کم از کم یہ کہ یہ شرط لازماً لغو اور غیر مؤثر قرار پائے گی۔ یہ اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ عقد نکاح کی نوعیت معاملہ بیع سے، اور مہر کی حیثیت زرین (قیمت) سے جوہری طور پر مختلف ہے۔ ایسی صورت میں مہر کی حیثیت اصلاً ایک لازمی ہدیے کے سوا اور کیا قرار پاسکتی ہے؟ بعض اہل نظر نے تو اس حقیقت کی بنا پر کہ زوجین کی باہمی رضا مندی بھی مہر کو ساقط نہیں ٹھیرا سکتی، اسے فعل عبادت جیسا عمل کہا ہے۔ (مِنْ جِهَتِهِ أَتَمَّا لَا يَجُوزُ التَّرَاضِي عَلَى اسْقَاطِهِ يُشْبِهُ الْعِبَادَةَ ۱۶)

مہر کی شرعی حیثیت جان لینے کے بعد اب اس کے مقاصد کو دیکھئے۔
۱۔ سب سے پہلا اور اہم مقصد تو عورت کے اور اس کے ساتھ قائم ہونے والے ازدواجی ربط کے شرف کا اعتراف و اظہار ہے۔ صاحب ہدایہ لکھتے ہیں کہ:-

المهر واجب شرعاً بانسبة لشرف المحل ۱۷
”مہر شرعاً واجب ہے، اس لئے تاکہ محل نکاح کے شرف کا

اظہار ہو۔“

۲۔ دوسرا مقصد یہ ہے کہ شوہر ازدواجی رشتہ باندھتے ہی آئندہ کی اپنی کفالتی ذمہ داریوں کا اچھی طرح ادراک کر لے اور پورے احساس کے ساتھ

۱۶ ہدایۃ المجتہد، جلد دوم ص ۱۶۔

۱۷ ہدایہ، جلد دوم ص ۳۰۳۔

یہ قدم اٹھائے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ مہر شوہر کے لئے اس بات کی ایک عملی یاد دہانی ہوتا ہے۔ کہ جس عورت سے وہ اس وقت رفاقت کا عہد باندھ رہا ہے۔ آخر دم تک اس کی ساری ضروریات زندگی اسے فراہم کرتے رہنا ہوں گی۔

۳۔ تیسرا مقصد یہ ہے کہ نکاح کے معاملہ میں سنجیدگی اور اہمیت کی آگاہی ہو جائے، پورے شعور کے ساتھ سمجھ لیا جائے کہ نکاح کرنا کوئی ایسا اقدام نہیں ہے جسے مذاق اور تفریح کی سطح پر رکھ کر راہ چلتے جب جی چاہے کر ڈالا جائے مہر کے طور پر مال کی ایک خاص مقدار دینے کی لازمی شرط، جس کی حیثیت ایک شرعی واجب اور فرض کی ہونہ کہ محض ایک خوش خلقی یا احسان کی، نکاح کے معاملے کی عظمت اور سنجیدگی کا ایک کھلا ہوا اعلان ہوتی ہے، یہ اس امر کی آگاہی دے رہی ہوتی ہے کہ جو شخص اس رشتہ رفاقت کو قائم کر رہا ہے اُسے اچھی طرح یہ سمجھ لینا چاہیے کہ وہ ایک بھاری عہد وفا استوار کر رہا ہے، وہ عہد وفا جس کو قرآن حکیم نے ”مِثَاقِ غَلِیْظٍ“ قرار دے رکھا ہے۔ (وَآخِذْنَ بِمِثَاقٍ غَلِیْظًا)۔

۴۔ چوتھا مقصد مرد کی طرف سے عورت کے تئیں اُلفت اور یگانگی کا اظہار ہے۔ ابھی معلوم ہو چکا کہ مہر کی اصل حیثیت ”لازمی ہدیے“ کی ہے۔ ہدیہ کی بابت سبھی جانتے ہیں کہ اس کی غرض و غایت باہمی محبت کی تخم ریزی اور استواری ہوا کرتی ہے۔ اس لئے مہر کا ذریعہ اظہار محبت ہونا ایک واضح حقیقت ہے۔ گویا یہ مہر اس ”مودت اور رحمت“ کی کلیدِ آغاز ہوتا ہے، جسے عام انسانی

فطرت ہی نہیں قرآن کریم بھی ازدواجی رشتے کی جان بتاتا ہے (وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً)۔

مہر کا یہ مقصد بھی مہر کے حق زوجیت کا معاوضہ ہونے کے خیال کی تردید کرتا ہے۔ کیونکہ معاوضہ یا قیمت دے کر حاصل کی ہوئی چیز ’ملوک‘ ہوتی ہے ’محبوب‘ اور سکونِ قلب کا سرچشمہ نہیں ہوتی۔

۷۔ اعلان اور شہادت

نکاح کا اعلان کے ساتھ کیا جانا ضروری ہے۔ ارشادِ نبویؐ ہے کہ۔

اعلنوا هذا النكاح واضربوا عليه بالمدافوف۔

”نکاح اعلان کے ساتھ کرو اور (اس غرض کے لیے) نکاح کے وقت

دَفْ بجاؤ۔“

سارے علماء اس پر متفق ہیں۔ کہ خفیہ طور پر کیا جانے والا نکاح جائز

نہیں ہوتا۔

اعلانِ نکاح کی قانونی حد یہ ہے کہ نکاح کم از کم دو گواہوں کی موجودگی

میں ہو۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت فرمائی ہے کہ:-

لَا نِكَاحَ إِلَّا بِوَلِيِّيَّ وَشَاهِدَيْنِ عَدْلٍ (ابن جبان)

”نکاح دلی اور دو معتبر گواہوں کی موجودگی ہی میں ہونا چاہیے۔“

اگرچہ سند کے اعتبار سے یہ کوئی مضبوط روایت نہیں۔ مگر مختلف قرائن

اس مضمون کو صحیح قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ ایک موقع پر جب حضرت ابن عباسؓ

نے لوگوں کے سامنے یہ فرمایا کہ ”دو عادل گواہوں کے بغیر نکاح، نکاح نہیں ہوتا، تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی نے اس بات سے اختلاف کا اظہار نہیں کیا۔ یہ اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ نکاح کے لئے شہادت کی ضرورت حضرات صحابہؓ کے یہاں معروف و مسلم تھی۔ اور ان کے یہاں اس ضرورت کا معروف و مسلم ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ ان کے نزدیک یہ بات شارع علیہ السلام کی فرمائی ہوئی تھی۔ کیونکہ یہ ممکن نہیں کہ وہ اسے بطور خود شرعاً واجب سمجھ بیٹھے ہوں۔

ان روایات کی بنا پر چاروں ائمہ اس پر متفق ہیں کہ نکاح کے لئے دو گواہوں کی موجودگی ضروری ہے، ورنہ وہ جائز نہ قرار پائے گا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ گواہوں کی موجودگی کے بغیر کیا جانے والا نکاح کالعدم اور باطل ہوگا۔ امام ابو حنیفہؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک تو کم از کم دو گواہوں کی یہ موجودگی نکاح کے انعقاد ہی کے وقت ضروری ہے۔ اگر نکاح کا ایجاب و قبول ہوتے وقت گواہ موجود نہ رہے تو وہ منعقد ہی نہ ہو سکے گا۔ لیکن امام مالکؒ کا کہنا یہ ہے کہ اگرچہ بہتر یہی ہے کہ گواہ نکاح ہوتے وقت ہی موجود ہوں، لیکن ایسا ہونا لازمی نہیں ہے، نکاح ہو جانے کے بعد زوجین کی پہلی یک جائی کے وقت بھی گواہوں کی موجودگی

۱۔ بحوالہ بدایۃ المجتہد، جلد دوم ص ۱۷۱۔

۲۔ کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعۃ جلد ۴ ص ۲۵۔

اور شہادت کافی ہو جاسکتی ہے۔

گواہوں کا مسلم ہونا بھی ضروری ہے۔ الا آنکہ عورت کتابیہ ہو۔ ایسی حالت میں دو ذمی غیر مسلموں کی شہادت بھی جائز ہو سکتی ہے۔
نکاح کے جائز اور قانونی طور پر تسلیم شدہ ہونے کے لئے اس شہادت اور اعلان کو جن مصالح کی خاطر ضروری قرار دیا گیا ہے۔ وہ تھوڑے سے غور و فکر سے باسانی سمجھ لئے جاسکتے ہیں :-

۱۔ سب سے بڑی مصلحت اور غایت تو یہ ہے کہ نکاح کے پردے میں بدکاری کی راہ کھل جانے کا امکان نہ پیدا ہو رہے۔ اگر نکاح کے لئے کسی شہادت اور اعلان کی قانونی طور پر ضرورت نہ ہو تو زنا کے جرم میں گرفتار مرد اور عورت (بشرطیکہ وہ بے شوہر کی ہو) پولیس اور عدالت کو پورے اطمینان کے ساتھ یہ جیل دے سکتے ہیں کہ ہم نے تو نکاح کر رکھا ہے، جس کے بعد ان کا کچھ نہ کر سکے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ صورت حال معاشرے کے بدکردار عناصر کو زنا کی کھلی چھوٹ دے دینے کے ہم معنی ہوگی، جس کے بعد کوئی سماج گندگیوں میں ات پت ہو جانے سے بچ نہیں سکتا۔ اس بھاری خطرے سے مسلم معاشرے کو محفوظ رکھنے کے لئے ضروری تھا کہ نکاح کے معاملے کو پوشیدہ طور پر سرانجام دے لینے کی ہرگز اجازت نہ دی جاتی اور اس کے لئے شہادت اور اعلان کو قانوناً لازم ٹھیرا دیا جاتا۔

۲۔ دوسری مصلحت اور غایت اس ضابطہ کی یہ ہے کہ ان نزاعات کے صحیح تصفیے کا اہتمام پہلے سے موجود رہے۔ جو زوجین کے درمیان آئندہ کبھی شرائط نکاح کے (اگر وہ کچھ رہی ہوں) یا مہر کے بارے میں پیدا ہو سکتی ہوں۔

۳۔ تیسری بات یہ کہ ان ممکنہ حق تلفیوں کا دروازہ بند کر دیا جائے، جو آئندہ کسی وقت نفس نکاح ہی کا انکار کر دیے جانے کے نتیجے میں رونما ہو سکتی ہیں۔ یہ انکار خود زوجین میں سے بھی کوئی کر سکتا ہے، اور ان کی وفات کے بعد ان کے ورثہ بھی کر سکتے ہیں۔ یہ کوئی مفروضہ نہیں ہے۔ بلکہ آئے دن کے مشاہدات ہیں۔ جب آدمی پر خرمیں دنیا مسلط ہو جاتی ہے۔ تو وہ اپنی اندگی اغراض کے لئے سب کچھ کر گزرتا ہے۔ دوسرے حق داروں کو ٹروم کر کے خود سارا ترکہ سمیٹ لینے کی خواہش نسب اور مصاہرت کے کسی بھی رشتے کا بلا تکلف انکار کر دیا کرتی ہے۔ جہاں تک ازدواجی رشتے کا تعلق ہے، اس کے حقوق کو اس خطرے سے محفوظ رکھنے کی عملی اور کارگر تدبیر یہی ہو سکتی ہے۔ کہ جب یہ رشتہ باندھا جا رہا ہو تو کم از کم دو گواہوں کی موجودگی میں باندھا جائے تاکہ وہ آئندہ ضرورت پڑنے پر اس کے بارے میں گواہی دے سکیں۔

ایک تقابلی جائزہ

کامن سول کوڈ کے چیلنج کا تقاضا

نکاح کے اسلامی قانون کے پہلو بہ پہلو، جس کی ضروری وضاحت اوپر کے صفحات میں گزر چکی، دنیا میں اور بھی بہت سے قوانین نکاح موجود ہیں، جو مختلف قوموں کے اپنے اپنے مخصوص عقائد و نظریات پر مبنی ہیں۔ عام طور پر ان قوانین کا اسلامی قانون نکاح سے چونکہ کوئی راست عملی تصادم نہیں ہے، اس لئے یہاں ان سے تعرض کرنا غیر ضروری ہو گا۔ لیکن ان میں سے ایک قانون ایسا بھی ہے جس کا معاملہ باقی سب سے مختلف ہے۔ یہ وہ قانون ہے جو کامن سول کوڈ کہے جانے والے مجموعہ قوانین سے تعلق رکھتا اور اس کا ایک جز و ترکیبی ہے۔ یہ کوڈ نہ صرف یہ کہ ایک مدت سے کتنے ہی ملکوں، قوموں اور ملتوں کی سرحدیں توڑ کر دنیا کے بیشتر حصوں میں دادِ حکمرانی دے رہا اور سکڑ رائج الوقت بنا ہوا ہے، بلکہ خود بھارت میں بھی اس کا نفاذ دستورِ مملکت کے رہنما اصولوں میں جگہ پا چکے ہے۔ جس کے نتیجے میں بلا امتیازِ مذہب و ملت تمام باشندگانِ ملک پر اسے نافذ کر دینے کی سلسل اور منصوبہ بند کوششیں ہو رہی ہیں، اور اس طرح وہ آج اسلام کے دیگر شخصی قوانین (مسلم پرسنل لا) کی

طرح اس قانونِ نکاح کے لئے بھی ایک زبردست اور خطرناک چیلنج کی حیثیت اختیار کیئے ہوئے ہے۔ اس صورتِ واقعی کی موجودگی میں اسلامی قانونِ نکاح کے تعارف کی بحث تشنہ ہی رہ جائے گی اگر آخر میں اس کو ڈپہ بھی ایک نظر نہ ڈال کر یہ نہ دیکھ لیا جائے کہ نکاح کے معاملے سے تعلق رکھنے والی اس کی بنیادی دفعات اسلامی قانون سے کس حد تک مختلف ہیں؟ اور اس اختلاف کی نظری وجوہ کیا ہیں؟ نیز یہ کہ اس کو ڈکے ذریعہ جو سماج وجود میں آسکتا ہے، اور آیا ہے، وہ اسلامی قانون کے ذریعہ تشکیل پانے والے سماج کے مقابلے میں کن معنوں میں ایک مختلف سماج ہوتا ہے؟ اس تقابلی جائزے کے بعد ہی اس چیلنج کی معقولیت کی بابت کوئی فیصلہ کیا جاسکے گا جو کامن سول لوڈ اسلامی قانون کو دے رہا ہے، اور ساتھ ہی ایک طالبِ حق کے لئے یہ سمجھ لینا بھی آسان ہو سکے گا کہ ان دونوں قانونوں کے اختلاف کی پوری نوعیت کیا ہے، اور اعتدال و توازن، معقولیت اور حقیقت پسندی، خیر و صلاح فی الواقع ان میں سے کس کی طرف ہے۔

اختلاف کے بنیادی نکات

نکاح کے معاملے میں دونوں قوانین جن اہم اور بنیادی باتوں میں ایک دوسرے کے مخالف واقع ہوئے ہیں ان کی مختصر وضاحت یہ ہے۔

اسلامی قانون کامن سول کوڈ

۱۔ نکاح کا معاملہ بھی ان معاملات میں نکاح کا معاملہ خالص دنیوی اور تمدنی

سے ایک ہے جو دین و شریعت کے دائرہ بحث میں شامل ہیں۔

۲۔ جوازِ نکاح کے لئے ہم دینی شرط لازم ہے۔

۳۔ لڑکیوں اور عورتوں کے نکاح کے معاملے میں ان کے سرپرستوں کو بھی ایک حد تک دخل حاصل ہے۔

۴۔ اگرچہ عام معمول یہی ہونا چاہیے کہ شادیاں بلوغ کے بعد ہی کی جائیں، مگر نابالغی میں بھی نکاح کر دیئے جانے کی اجازت ہے۔

۵۔ بعض اہم چیزوں میں مرد کو عورت کا کفو (ہم سر) ہونا چاہیئے، خصوصاً دین و تقویٰ میں۔

۶۔ نکاح کے صحیح اور قانونی طور پر

معاملہ ہے، اس کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔

جوازِ نکاح کے لئے ہم دینی کی کوئی اہمیت نہیں، مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان بلا تامل رشتہِ نکاح قائم ہو سکتا ہے۔

لڑکیوں اور عورتوں کے معاملے میں اُن کے سرپرستوں کو مداخلت کا کوئی حق حاصل نہیں۔ وہ بھی اپنے نکاح کے معاملے میں ویسی ہی آزاد اور خود مختار ہیں جس طرح مرد ہوتے ہیں۔

بلوغ ہی نہیں 'قانونی' بلوغ سے بھی پہلے (جو واقعی بلوغ کے بھی کہیں بعد میں ہوا کرتا ہے) نکاح ممنوع اور خلافِ قانون ہوگا۔

کفایت اور ہم سری کی کوئی قانونی اہمیت نہیں۔

نکاح کے صحیح اور قانونی طور پر جائز قرار

جائز قرار پانے کے لئے کم از کم دو مسلمان گواہوں کی موجودگی ضروری ہے۔

پانے کے لئے یہ بالکل کافی ہے کہ مرد اور عورت یا لڑکا اور لڑکی دونوں میرج آفیسر کے دفتر میں جا کر باہم شادی کرنے کا اعلان و اندراج کرا دیں، کسی مزید شہادت کی کوئی ضرورت نہیں۔

اس بارے میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ اسلامی قانون اور سول کوڈ کے یہ اختلافات انتہائی اہم اور بنیادی قسم کے ہیں۔ ایک کے یہاں جو بات اصل الاصول کی حیثیت رکھتی ہے۔ دوسرے کے یہاں کسی شمار قطار میں نہیں ایک کی نگاہ میں جو چیز نکاح کے بنیادی مقاصد تک میں شامل ہے۔ دوسرے کی نگاہ میں اسے کوئی اہمیت ہی حاصل نہیں۔ ظاہر ہے کہ اتنا بڑا اختلاف فکر و نظر کے کسی معمولی فرق کا نتیجہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اختلاف کی یہ نوعیت بجائے خود اس بات کی دلیل ہے کہ اس کی جڑیں کافی گہرائی میں ہیں اور اندر ہی اندر دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ سطح پر کے یہ باہمی فاصلے دراصل نتیجہ ہیں اس بات کا کہ ان دونوں قانونوں کے تہذیبی نقطہ ہائے نظر اور ان کے نظریاتی پس منظر بہت بڑی حد تک الگ الگ ہیں اور ان کے مقاصد بھی یکساں نہیں ہیں، حتیٰ کہ معاشرے کی تعمیر کا تصور بھی ان کا بہت کچھ ایک دوسرے سے جدا ہے۔ ایسی حالت میں ان دونوں قانونوں کے تقابلی جائزے کے لئے بالکل ضروری ہوگا کہ پہلے ان کے یہ اصولی نظریاتی اور مقصدی

اختلافات نمایاں ہو کر سامنے آجائیں اور اچھی طرح دیکھ لیا جائے کہ اسلامی قانون کے خطوط پر کس قسم کا معاشرہ تشکیل پائے گا، اور اس کے مقابلے میں سول کوڈ کے خطوط پر تعمیر ہونے والے معاشرے کی تصویر کیا ہوگی؟

اسلامی قانون نکاح کے اصول و مقاصد

جہاں تک اسلامی قانون نکاح کے نظریاتی پس منظر اور اس کے اصول و مقاصد کا تعلق ہے، اوپر کے صفحات میں ان کی پوری وضاحت ہو چکی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے :-

بنیادی اصول :

۱۔ نکاح کا معاملہ بھی ان معاملات میں شامل ہے۔ جو شریعت کے دائرہ بحث میں داخل ہے اور اس سلسلے میں دینی مصالح کو دوسری تمام مصلحتوں اور ضرورتوں کے مقابلے میں قطعی ترجیح اور اولیت حاصل ہے۔

۲۔ افراد اور معاشرے کی اخلاقی پاکیزگی (عفت) کے تحفظ کا ہر ممکن اہتمام ناگزیر ہے۔

۳۔ عورتوں اور بالغ لڑکیوں کی خود مختاری اور آزادی رائے بھی اگرچہ ہر احترام کی مستحق ہے، لیکن ان کے خاندانی وقار، ان کے مستقبل کے ٹھوس اور حقیقی مفادات، اور نکاح کے اصل مقاصد کو اس خود مختاری کے ہاتھوں مجروح نہ ہونے دینا چاہیے۔

۴۔ ایسی تمام باتوں کا سد باب ضروری ہے جو نکاح کی غرض و غایت کو متاثر

کرنے اور اس کے رشتہ کے استحکام میں خلل ڈالنے والے ہوں۔

۵۔ قانون میں صرف عام حالات ہی کے مسائل نہیں، بلکہ مخصوص اور استثنائی حالات کے مسئلوں کا بھی حل موجود ہونا چاہیئے۔

مقاصد:

۱۔ نسل انسانی کی بقا و تسلسل۔

۲۔ اخلاقی پاکیزگی (عفت) کا ہر ممکن تحفظ۔

۳۔ ایسی پرسکون تمدنی اکائیوں (خاندانوں) کی تشکیل جس کے اندر باہمی اُلفت، یک جہتی، احترام، ایثار اور حقوق شناسی و احساس ذمہ داری کی پوری پوری کار فرمائی ہو۔

۴۔ خاندانی اور معاشرتی استحکام۔

۵۔ دینی اور سماجی مصالح کی تکمیل۔

اسلامی قانون نکاح اپنے ان بنیادی اصولوں اور اپنے ان مقاصد کے تحت جس قسم کا معاشرہ بنا سکتا ہے۔ وہ کسی بیان و تفصیل کا محتاج نہیں صاف دیکھا جاسکتا ہے کہ یہ ایک ایسا معاشرہ ہوگا (بشرطیکہ اس کی تعمیر واقعی معنوں میں اس قانون پر اور اس کے ساتھ اسلام کے دوسرے قوانین شخصی پر بھی ہوئی ہو) جو ہر سطح پر متحد، منظم اور مستحکم ہوگا، جس کی صرف بنیادی اکائیاں (ابتدائی خاندانی حلقے) ہی نہیں بلکہ اوپر کا وسیع خاندانی دائرہ بھی ایک زنجیر کی کڑیوں کی طرح آپس میں جڑا ہوا ہوگا۔ یہ ایک ایسا پاکیزہ معاشرہ ہوگا جس کے اندر جنسی بے راہ روی کے عملی امکانات کم سے کم ہوں گے، اور نظری طور پر اسے قابل گوارا

سمجھنے کا تصور تک ناپید ہو گا۔ یہ ایک ایسا آزاد اور ساتھ ہی منضبط معاشرہ ہو گا۔ جس میں اپنے نکاح کے معاملے میں افراد کی آزادی اور خود مختاری کو پورا پورا احترام حاصل ہو گا۔ مگر یہ آزادی اہم تر مصالح کی بہر حال پابند ہوگی، اور کسی کو یہ چھوٹ ہرگز نہ ہوگی۔ کہ وہ اپنی خود مختاری کی ترنگ میں آکر ہر معقولیت کو بالائے طاق رکھ دے اور دینی، اخلاقی یا معاشرتی کسی مصلحت کو خاطر میں نہ لائے۔ پھر یہ ایک ایسا معاشرہ بھی ہو گا۔ جس کے افراد آپس کے حقوق، جن میں زوجین کے باہمی حقوق خصوصیت سے داخل ہیں، اپنے اندرونی داعیہ کیساتھ ادا کیا کریں گے۔ صرف قانون کا مطالبہ یا انسانیت کا تقاضا سمجھ کر نہیں بلکہ دین کا فریضہ اور خدا کا حکم سمجھتے ہوئے کریں گے۔ انہیں نظر انداز کر کے وہ کوئی اطمینان نہ محسوس کر سکیں گے۔ کیونکہ انہیں یقین ہو گا کہ ان حقوق کے بارے میں چلے کوئی طاقت ان سے باز پرس نہ کر پائے، مگر اس قادر مطلق کی عدالت میں یہ باز پرس لازماً ہو کر رہے گی۔ جس نے یہ حقوق ان پر عائد کر رکھے ہیں۔ یہ ہے وہ مستحکم، منضبط، پاکیزہ اور فرض شناس معاشرہ جو اسلامی قانون نکاح کے ذریعے (جب کہ اسے اسلام کے دوسرے قوانین شخصی کی بھی معیت حاصل ہو) وجود میں آئے گا، اور تاریخ گواہ ہے کہ ایسا مدتوں ہو چکا ہے حتیٰ کہ کج کے دورِ زوال میں بھی مسلم سماج ان صفات میں دوسرے سماجوں پر نمایاں فوقیت رکھتا ہے۔

سول کوڈ کے اصول و مقاصد

سول کوڈ نکاح کے معاملے کو جس نظر سے دیکھتا ہے اور اس کیلئے قانون بناتے وقت جو اصول اور

جو مقاصد اپنے سامنے رکھتا ہے، ان کی نشان دہی اس کی ان بنیادی دفعات سے خود بخود ہو جاتی ہے۔ جنہیں ابھی ادھر بیان کیا جا چکا ہے۔ اس کی ضروری وضاحت حسب ذیل ہے:-

بنیادی اصول:

۱۔ نکاح کا معاملہ خالص دنیوی اور تمام تر ایک تمدنی معاملہ ہے۔ مذہب، مذہبی قدریں اور مذہبی مصلحتیں اس کے سلسلے میں یکسر ناقابل توجہ ہیں۔ [چنانچہ مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے مابین شادی کی قانونی اجازت دینا اور قانون بناتے وقت کسی اہم سے اہم دینی حکم یا مصلحت کی بھی رعایت ملحوظ نہ رکھنا اس کے یہاں اس اصول کے مسلمہ ہونے کی کھلی ہوئی دلیل ہے]۔

۲۔ دوسرے تمام تمدنی معاملات کی طرح نکاح کے معاملے میں بھی مرد اور عورت دونوں مکمل مساوات اور یکساں آزادی رکھتے ہیں [عورتوں اور بالغ لڑکیوں کے نکاح کے معاملے میں ان کے سرپرستوں کے لئے کسی طرح کے بھی دخل کا حق تسلیم نہ کیا جانا واضح طور پر اسی اصول کا مظہر ہے]۔

۳۔ اخلاقی پاکیزگی (عفت) کو کوئی بنیادی اور لازمی اہمیت حاصل نہیں 'اہم' قومی مصالح کے مقابلے میں وہ بہر حال ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔ [واقعی بلوغ ہی تک نہیں بلکہ قانونی بلوغ تک نکاح کی ممانعت اس اصول کی موجودگی کا بین ثبوت ہے]۔

۴۔ نکاح کے رشتے میں بندھنے والے دونوں افراد کی زیادتی پسند اور رضامندی

ہی اس معاملہ میں واحد فیصلہ کن چیز ہے، اس کے بعد کوئی بھی شے ایسی نہیں رہ جاتی۔ جسے اس رشتہ کے استحکام اور اس کے مقاصد کی تکمیل کی خاطر کوئی اہمیت دی جاسکے۔ [اہم دینی، کفائت اور سرپرستوں کے حق ولایت کی کوئی ضرورت تسلیم کیئے جانے کے پیچھے اس اصول کی کارفرمائی بھی یقینی طور پر موجود ہے]۔

۵۔ نکاح کے لئے قانون بناتے وقت صرف انہی امور کو سامنے رکھا جائے گا۔ جو اس سول کوڈ کے نزدیک مقاصد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قانون میں مخصوص اور استثنائی حالات کی رعایت چونکہ ان مقاصد کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔ اس لئے انہیں لازماً نظر انداز کر دیا جائے گا۔ [نابالغوں کی شادی کی قطعی ممانعت، اسی طرح یک زوجگی پر شدید اصرار اس اصول کے تسلیم شدہ ہونے کی واضح شہادت ہے۔

مقاصد :-

۱۔ نسل انسانی کی بقاء (مگر اقتصادی خوش حالی کی خاطر کثرت آبادی پر کنٹرول کے ساتھ)۔

۲۔ ایک متحد قوم اور متحدہ وطنی قومیت کی تشکیل۔

۳۔ معاشرتی معاملات میں ہر مرد اور ہر عورت کی مکمل اور مساوی

آزادی۔

۴۔ معاشرتی معاملات سے مذہب کی بے دخلی۔

سول کوڈ کی ان قانونی دفعات اور اس کے ان اصول و مقاصد کی اسکا

پر بننے والا معاشرہ کس قسم کا معاشرہ ہوگا، اس سوال کا جواب خود انہی دفعات اور انہی اصول کے اندر موجود ہے۔ کیونکہ کوئی بھی سماج قدرتی طور پر اپنی اصول و مقاصد کا آئینہ دار ہوا کرتا ہے۔ جن کو سامنے رکھ کر اس کی تشکیل ہوئی ہو۔ اس حقیقت کی روشنی میں سول کوڈ کے تحت تشکیل پائے ہوئے معاشرے کے خط و خال حسب ذیل ہی ہو سکتے ہیں:-

۱۔ سب سے پہلی اور سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ یہ معاشرہ دین اور دینی قدروں سے بڑی حد تک آزاد معاشرہ ہوگا۔ یہ صحیح ہے کہ یہ قانون بظاہر مذہب کی نفی نہیں کرتا، نہ تو اس کے عقائد کے لئے ذہنوں کے دروازے بند کر ڈالتا ہے نہ اس کی عبادت گاہوں پر قفل لگا دینا چاہتا ہے، مگر یہ کہنا کسی طرح صحیح نہیں کہ مذہب کے بارے میں اس کا زاویہ نگاہ بھی منفی نہیں ہے۔ جس مذہب کا اپنے پیروؤں کی زندگی سے رشتہ اس طرح کاٹ دیا گیا ہو کہ شادی بیاہ جیسے نجی مسئلے میں بھی وہ زبان نہ کھول سکتا ہو۔ اس کے لئے انکے دلوں میں سچی عقیدت اور سچا ایمان آخر کب تک باقی رہ سکے گا؟ اور وہ ماضی کی ایک مقدس یادگار یا ایک بے جان روایت بن کر کیوں نہ رہ جائے گا؟ پس سول کوڈ کے گھیرے میں جکڑے ہوئے غیر مذہب کا حال اس چھوٹے سے جزیرے کے حال سے ہرگز مختلف نہیں ہو سکتا جو کسی تیز رو دریا کے پتہ میں واقع ہو، جس کے باعث دریا کے دھارے بھی اسے برابر کاٹتے رہتے ہوں اور خود اس کے اندر بھی زیر سطح ٹوٹ پھوٹ کا عمل جاری ہو اور باتوں کو چھوڑنے، صرف مختلف مذاہب کے پیروؤں کے مابین قائم ہونے

ولے ازدواجی رشتوں ہی کی بات کو لے لیجئے۔ قیاس اور تجربہ دونوں اس امر کے گواہ ہیں کہ ایسے رشتے مرد اور عورت دونوں ہی کو مذہب کے بارے میں حد درجہ غیر سنجیدہ بنا کر رکھ دیتے ہیں۔ غرض یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ سول کوڈ کے تعمیر کیے ہوئے معاشرے میں مذہب ایک ٹھکرایا ہوا اچھوت بنا دیا گیا ہوگا۔ جہاں اُسے موت سے بدتر زندگی بسر کرنی ہوگی۔ اور سچی بات تو یہ ہے۔ کہ اس قانون کے مخلص علم بردار دراصل چاہتے بھی یہی ہیں ورنہ یہ کوئی سمجھ میں آنے والی بات نہیں کہ وہ اس کے فطری عملی نتائج سے بے خبر ہوں گے۔ ایسا گمان کرنا بھی ان کی دانش وری کی کھلی ہوئی توہین ہوگی درحقیقت اس سول کوڈ کا سرچشمہ ہی وقت کی وہ حکمراں تہذیب ہے، جس کا پورا خمیر ہی مادیت سے اٹھایا گیا ہے۔ مادیت جو کچھ سوچے گی قدرتی طور پر اپنے فلسفے کے فروغ ہی کے لئے سوچے گی۔ اس لئے اس کے ذہن کا ڈھلا ہوا یہ سول کوڈ بھی اگر دین و اخلاق کی جڑیں کاٹ ڈالنا چاہتا ہو تو یہ کوئی خلاف توقع بات ہرگز نہ ہوگی۔

۲۔ دوسری بات یہ کہ اس معاشرے میں عفت و عصمت کی قدر بتدریج دم توڑتی چلی جائے گی۔ جب واقعی بلوغ کے بعد بھی کسی نہ کسی مدت تک نکاح قانوناً ممنوع رہے گا تو کتنے نوجوان ایسے نکل سکتے ہیں۔ جو اپنے جنسی کردار کو بالکل بے داغ رکھ سکیں، اور وہ بھی آج کے حالات میں، جب کہ ایک تو اخلاقی حس پر یوں بھی مُردنی چھاتی چلی جاتی ہے، دوسرے جنسی جذبات کی آگ پر تیل کا چھڑکاؤ بھی برابر ہوتا رہتا ہے، جس کے لئے

مخلوط تعلیم اور پوتہ فسطیول موجود ہیں، سینما اور ناچ رنگ کی محفلیں موجود ہیں، فلمی گانے اور فحش لٹریچر موجود ہیں، زنا بالرضا کی قانونی چھوٹ موجود ہے اس صورت حال کی موجودگی میں زیادہ سے زیادہ توقع جو رکھی جاسکتی ہے۔ وہ صرف یہی ہو سکتی ہے کہ اس معاشرے میں اخلاقی پاکیزگی کو بس ایک پسندیدہ چیز سمجھا جاتا ہے۔ جس کا مطلب صرف یہ ہوگا کہ اگر یہ صفت لوگوں میں پائی جائے تو بہت اچھا ہے، یہ ہرگز نہ ہوگا کہ اس کے پائے جانے کے لئے وہ عملی تدبیریں بھی لازماً اختیار کی جائیں جو عقلی، نفسیاتی اور تجرباتی نقطہ نگاہ سے ناگزیر ہیں۔

۳۔ تیسری بات یہ کہ یہ معاشرہ اپنے دعوے اور اپنی توقع کے برعکس ایک غیر مستحکم معاشرہ ہوگا، اور اس کی نوعیت فی الواقع بکھری ہوئی اکائیوں کے مجموعے سے زیادہ کچھ نہ ہوگی۔ فرد کی معاشرتی آزادی جہاں اس حد کو پہنچی ہوئی ہو کہ نو عمر لڑکیاں تک بھی اپنی آئندہ کی زندگی کے معاملے میں مطلقاً خود مختار ہوں۔ نہ مذہب کی کوئی ہدایت ان کے لئے واجب التسلیم ہو، نہ اپنے بزرگوں کے جذبات کو خاطر میں لانے کی وہ مکلف ہوں، نہ انہیں بالغ نظری، دور اندیشی اور تجربہ کاری پر مبنی ان کے خیر خواہانہ مشوروں کو کوئی وزن دینا ہو، حتیٰ کہ اخلاقی اور رسمی طور پر بھی ان سے رجوع کرنے کی انہیں کوئی ضرورت نہ ہو۔ — وہاں یہ کیوں کر ممکن ہے کہ خون اور قرابت کے رشتے اپنی اہمیت اور معنویت کھوتے نہ چلے جائیں گے، اور ماں، باپ، بھائی، بہن، چچا، تایا وغیرہ اعزہ کے تئیں یگانگی کے جذبات

کی وہ فطری گرم جوشی باقی رہ سکے گی۔ جوان کے حق میں ہمدردی، مواسات اور ایثار کا قالب اختیار کرتی رہتی ہے اور اس طرح خاندانی اور معاشرتی روابط کو زندگی اور پائنداری عطا کرتی ہے۔ فرد کی اس بے قید آزادی کا نتیجہ یقیناً اسکے سوا اور کچھ نہیں نکل سکتا کہ ایک مرد اور ایک عورت سے وجود میں آنے والی ہر نئی اکائی صرف اپنی محدود ترین دنیا سے غرض رکھے، اور اس دائرے سے باہر کون کس حال میں ہے۔ یہ دیکھنے کی کوئی ذمہ داری اس پر مطلق عائد نہ ہو۔ ظاہر بات ہے کہ جو معاشرہ ایسی خود غرض اکائیوں سے مل کر بنا ہوگا اسے اندر سے ایک پھٹا ہوا معاشرہ ہی کہا جاسکے گا۔

پھر بات یہیں تک محدود نہیں رہ جاتی بلکہ اندیشہ ہے کہ بجائے خود یہ چھوٹی چھوٹی اکائیاں بھی عدم استحکام کا شکار ہونے سے محفوظ نہ رہ جائیں گی۔ کیونکہ نکاح کے رشتہ کی پائنداری کے لئے جن فکری، ذہنی، نفسیاتی اور جذباتی یک جہتیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور جو اعلیٰ صفات درکار ہوتی ہیں، یہ قانون نہ صرف یہ کہ ان کے پیدا کرنے سے بڑی حد تک قاصر رہتا ہے۔ بلکہ اکثر ان کے لئے رکاوٹ بھی بنتا ہے۔ وہ نکاح کے سلسلے میں نہ زوجین کی ہم دینی کی کوئی ضرورت محسوس کرتا ہے، نہ کفالت کو کوئی اہمیت دیتا ہے، اور نہ سرپرستوں کا کوئی حق ولایت تسلیم کرتا ہے اس کے علاوہ کتنی ہی دینی اور اخلاقی قدروں کو بھی پس پشت ڈال دیتا ہے۔ حالانکہ یہ وہ چیزیں ہیں جو نکاح کے رشتہ کو ناکامی کے خطرات سے اچھی طرح محفوظ رکھنے کے لئے کسی نہ کسی پہلو سے بہر حال ضروری ہیں۔ ایسی حالت

میں یہ توقع کیسے رکھی جاسکتی ہے۔ کہ سول کوڈ کی بنیاد پر وجود میں آنے والی ابتدائی معاشرتی اکائیاں بجائے خود بھی پوری طرح مستحکم اور یک جہت رہیں گی۔

ویسے دنیا میں کوئی بھی شر، خیر سے یکسر خالی نہیں ہوتا، نہ ہو سکتا ہے کیونکہ ایسی شکل میں کہیں بھی اسے قبول نہ کیا جاسکے گا۔ اس کلیتہ سے یہ سول کوڈ بھی مستثنا نہیں۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے۔ کہ اس کے مقاصد میں بہت سے اچھے مقاصد بھی شامل ہیں۔ مثلاً یہ کہ سماج ایک متحد سماج بنے، قوم تندرست اور توانا افراد کی قوم ہو، لوگوں کی معاشرتی زندگی بے جا بندھنوں سے آزاد ہے لیکن مصیبت یہ ہے کہ ان صحیح مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے وہ جو تدبیریں اختیار کرتا ہے۔ وہ انتہائی غلط اور ناقص ہوتی ہیں۔ وہ نہیں جانتا، یا نہیں جانتا چاہتا کہ کسی بھی مقصد کو حاصل کرنے کا ایسا طریقہ، جو اس سے بڑے یا کم از کم اسی درجے کے مقاصد کو کھلا ہوا نقصان پہنچا دینے والا ہو، دانش مندی کا طریقہ نہیں ہوا کرتا، اور یہ کہ یک رخا پن ہمیشہ بُرے نتائج پیدا کرتا ہے۔ قانون کی اولین خوبی یہی ہے کہ اس کی نگاہ معاملے کے سبھی پہلوؤں پر ہو۔ اور مختلف قسم کی مصلحتوں کا لحاظ رکھنے میں توازن کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے، ورنہ وہ معاشرے کی تعمیر کی جگہ اس کی تخریب کا موجب بن جائے گا۔ اتنی بڑی اور اتنی واضح حقیقت سے دانستہ یا نادانستہ انحراف کرنے کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ یہ سول کوڈ اپنے اچھے مقاصد میں بھی ناکام ہی رہے مثال کے طور پر وہ سماج کو ایک متحد سماج بنانا چاہتا

ہے۔ اور اس غرض کے لئے آنکھ بند کر کے ہر قسم کے سماجی اور نفسیاتی حقائق اور دینی اختلافات کو ناقابل اعتنا ٹھہرا دیتا ہے، حتیٰ کہ نکاح کے قانونی جواز کے لئے ہم دینی کی بات تک نہیں سُننا چاہتا۔ اس حقیقت سے قطع نظر، کہ سماجی اتحاد کی یہ انتہا پسندانہ اور یک رُخی تدبیر معاشرے کو کیسے کیسے عوارض میں مبتلا کر دے گی، خود یہ مقصد اتحاد بھی اس سے صحیح معنوں میں ہرگز نہیں حاصل ہو سکتا۔ اور کسی حد تک حاصل بھی ہو سکتا ہے تو عورتوں، حتیٰ کہ لڑکیوں تک کو اپنے نکاح کے معاملے میں ہر طرح کی بے قید آزادی دے کر اس نے اس امکان اور اُمید کی بھی جڑیں بڑی حد تک کھوکھلی کر کے رکھ دی ہیں۔

اسی طرح نکاح کی عمر کے مسئلے کو دیکھیے۔ یہ قانون نہ صرف یہ کہ بچپن کی شادیوں پر مکمل پابندی عائد کر دیتا ہے۔ بلکہ بلوغ کے بعد بھی چند برسوں تک اس کی اجازت نہیں دیتا، اور اس پابندی کا ایک خاص مدعا یہ بتاتا ہے کہ اس سے قوم کو ایک تندرست اور توانا قوم بنانا مقصود ہے۔ لیکن اس کی نظر اس حقیقت کی طرف نہیں جاتی کہ قوم کی صحت کو جتنا خطرہ بچپن کی شادیوں سے ہو سکتا ہے۔ اس سے کہیں بڑا خطرہ ان اخلاقی خرابیوں اور جنسی بے راہ رویوں سے ہے جو اس پابندی کے نتیجے میں قوم کے نوجوالوں میں لازماً پھوٹ پڑے گی۔

تجربات کی گواہی

سول کوڈ کے بنائے ہوئے معاشرے کی یہ تصویر کوئی ایسی تصویر نہیں ہے

جسے خواہ مخواہ کی مخالفانہ خیال آرائی کا نتیجہ قرار دے کر مسترد کر دیا جائے بلکہ یہ حقیقت اور واقعیت کی عکاس تصویر ہے جس کی سچائی پر فکر و نظر کی شہادتیں ہی نہیں عالم واقعہ کی گواہیاں بھی موجود ہیں۔ چنانچہ جن ملکوں میں یہ کوڈ ایک معقول مدت سے نافذ ہے۔ اور اس لئے اپنے فطری جوہر کا اچھا خاصہ عملی مظاہرہ بھی کر چکا ہے، وہاں بالعموم ایسے ہی معاشرے وجود میں آچکے ہیں اس بات کی تصدیق کے لئے وہ رپورٹیں ہر طرح کافی ہیں۔ جو اقوام متحدہ کے متعلقہ اداروں اور خود ان ممالک کے اپنے سرکاری محکموں کی طرف سے وہاں کے سماجی حالات کے بارے میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔

جہاں تک ان ملکوں میں مذہب کا تعلق ہے، اس کا حال کسی پر مخفی نہیں ان میں سے جن ملکوں میں کمیونزم کا دور دورہ ہے، وہاں تو مذہب غریب بالکل ہی صیدزبوں بن کر رہ گیا ہے۔ اس کے ایک ایک اہم نشان اور اس کی ایک ایک بنیادی قدر کو مٹا ڈالنا ان کا شعار بنا ہوا ہے۔ مجال نہیں کہ کوئی دین کی تبلیغ و اشاعت کا نام بھی لے سکے۔ غیر اشتراکی ملکوں میں اگرچہ سرکاری سطح پر مذہب دشمنی کا یہ عالم نہیں ہے، لیکن وہاں بھی پوری زندگی کا نظام جس ڈگر پر چل رہا ہے اس میں مذہب کی نفی آپ سے آپ دھیمی پڑتی چلی جا رہی ہے۔ بالخصوص نوجوان نسل تو اسے ایک بوسیدہ لباس کی طرح اٹار کر دور پھینک چکی ہے۔ ان ساری باتوں کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ دنیوی نظام تمدن و معاشرت کے دل دادہ یہ ممالک پوری طرح مادیت میں غرق ہوتے چلے جا رہے ہیں۔

اخلاقی پاکیزگی کا حال تو ان ممالک میں اور زیادہ اتر رہا ہے۔ جلسی بے راہروی

وہاں جیسے وقت کا سب سے بڑا 'معروف'، بن چکی ہے۔ بعض زیادہ 'ترقی یافتہ' سماجوں میں اس 'معروف' کی ترقی اور ہمہ گیری کی رفتار اتنی تیز ہے کہ اب کوئی مرحلہ ایسا باقی نظر نہیں آتا جو سر نہ کر لیا گیا ہو۔ عام معنوں کی جنسی آزادی پر تو سماج کا عمل اور قانون کی رہنمائی کافی پُرانی بات ہو چکی ہے۔ اب اس سلسلے میں ایسی ایسی 'ایجادات' سامنے آرہی ہیں۔ جن کا کل تک شیطان بھی تصور نہ کر سکا ہوگا۔

مثال کے طور پر برطانوی سماج کو دیکھ لیجئے۔ اس سماج کے عوام ہی نے نہیں خواص نے بھی ہم جنسی کے قانونی جواز کا اس شدت سے مطالبہ کیا۔ کہ پارلیمنٹ نے صرف ہم جنسی ہی کی نہیں، ہم جنسوں کے 'نکاح' تک کی اجازت کا بل پاس کر دیا، اور اب یہ قانون وہاں کے 'سول کوڈ' کی ایک دفعہ بن چکا ہے۔

اقوام متحدہ کی ایک رپورٹ کے مطابق پنا مائی پچتر فی صدی پچتر عوامی پیدا ہو رہے ہیں۔ امریکی رسالے ٹائمز نے کچھ مدت پہلے اپنی ایک اشاعت میں بتایا تھا کہ "سڈ" میں صدر ٹکسن کے مقرر کردہ ایک کمیشن نے امریکی عورتوں اور لڑکیوں میں جنسی بے راہ روی کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ ۶۹ فی صد امریکی لڑکیاں بیس سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے اپنے کنوارے پن سے محروم ہو چکی ہوتی ہیں، اور گیارہ فی صد تو پندرہ سال کی عمر سے بھی پہلے اپنی دوشیزگی ختم کر چکی ہوتی ہیں۔ کنواری ماؤں کی تعداد پانچ لاکھ سے اوپر ہے، اور پندرہ لاکھ لڑکیوں نے ڈاکٹروں کے ذریعہ اپنے حمل گروائیے۔ حد یہ سے کہہ سکی لڑکیاں اسکولوں اور

کالہوں سے گھر واپس آنے پر اپنے والدین سے سوال کرتی ہیں کہ وہ آج کی رات کس لڑکے کے ساتھ گزاریں۔ اور کون سی احتیاطی تدبیریں اختیار کریں؟

انہی چند مثالوں سے پوری صورت حال کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

عفت و عصمت کا یہ قتل عام ان ’مہذب ترین‘ ممالک میں کیوں ہو رہا ہے؟

یہ کوئی ایسا سوال نہیں جس کے ایک سے زیادہ جواب دیے جاسکیں۔ یہ

واضح طور پر اسی اندازِ فکر و عمل کا نتیجہ ہے۔ جو معاشرے کی تعمیر و تنظیم کے

بارے میں تہذیب جدید نے اختیار کر رکھا ہے۔ چنانچہ جسم فروشی کے

موضوع پر بین الاقوامی فیڈریشن کا جو پمپسیواں اجلاس اکتوبر ۱۹۷۲ء میں دہلی

میں ہوا تھا۔ اس نے اپنے چار دن کے طویل مباحثے کا حاصل یہی قرار دیا

تھا کہ ”دنیا میں جسم فروشی کے روز افزوں رواج کی وجہ یہ ہے کہ سماج کا

خاندانی ڈھانچہ کم زور ہو گیا ہے۔ اور لوگوں میں اخلاقی اقدار سب سے بے نیازی

پائی جانے لگی ہے۔ شراب، نشہ آور اشیاء اور فحش لٹریچر نے اس لعنت

کو اور بڑھا دیا ہے۔“

خاندانی اور معاشرتی استحکام بھی ان ممالک میں زوال کی آخری حدوں

کو پہنچ رہا ہے۔ چنانچہ آپ نے جسم فروشی کے موضوع سے متعلق بین الاقوامی

فیڈریشن کا ابھی یہ اعتراف سنا کہ ”سماج کا خاندانی ڈھانچہ کم زور ہو گیا

ہے۔ اور لوگوں میں اخلاقی اقدار سب سے بے نیازی پائی جانے لگی ہے، اخلاقی

قدروں سے اس بے نیازی کی بھی اب کوئی انتہا نہیں باقی رہنا چاہتی۔ ابھی

حال ہی کا واقعہ ہے کہ انگلینڈ میں تنہائی کے عالم میں ایک بڑھیا کا انتقال ہو گیا

جب اس کے لڑکے کو یہ خبر پہنچائی گئی۔ تو ’سعادت مند‘ صاحبزادے نے مُردوں کے کفن و دفن کا انتظام کرنے والی ایک تنظیم کو ٹیلیفون کیا کہ فلاں جگہ ایک بوڑھی خاتون وفات پاگئی ہے، اس کی تجہیز و تکفین کر دی جائے اور اس سلسلے کے مصارف کا بل میرے پاس بھیج دیا جائے۔ سوچئے تو یہی، جہاں ماں بیٹے کا جیسا مضبوط ترین فطری رشتہ بھی اتنا سطحی اور بے جان ہو رہا ہے۔ وہاں انسانیت کے زندہ رہ جانے اور خاندانی و معاشرتی استحکام نام کی کسی چیز کے پائے جانے کی کوئی توقع کیسے رکھی جاسکتی ہے۔

آخر میں ان ممالک کے معاشرتی استحکام اور اخلاقی اقدار کے پاس و لحاظ کی بابت ایک اور بیان سُن لیجئے۔ یہ بیان باہر کے کسی جائزہ نگار کا نہیں بلکہ خود ایک ’صاحب خانہ‘ کا ہے۔ برطانیہ کی مشہور ماہر بہبودِ اطفال، مسز لنکن رالف، نے انڈین سائنس کانگریس کے تحت جنوری ۱۹۷۳ء میں منعقد ہونے والے ایک اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے بتایا کہ :

”مغرب میں مشرک خاندان کا خاتمہ ہو چکا ہے اور اس صورتِ حال نے وہاں بہت سے مسائل کھڑے کر دیئے ہیں۔ انہوں نے زید کہا کہ خاندان کی شکل خواہ کچھ بھی ہو۔ یہ استحکام کے لئے ضروری ہے کہ اخلاقی قدریں برقرار رہیں۔“

یہ ہے وہ عملی تجربہ، اور یہ ہے وہ دینی حس، اخلاقی اقدار، اور معاشرتی احکام کا حشر جس سے سیکولر طرزِ حیات اور سول کوڈ کے دل داوہ ممالک آج دوچار ہیں۔ اس کے مقابلے میں اسلامی طرزِ حیات اور اسلامی قوانینِ معنویت

کے ثمرات وہ ہیں جن کی نشان دہی اوپر کے صفحات میں آپ کے سامنے
تفصیل سے آچکی۔ کیا ان دونوں کے اس تقابلی جائزے کے بعد بھی اسلام
کے شخصی اور معاشرتی قوانین پر، جن میں نکاح کا قانون سب سے زیادہ بنیادی
اہمیت کا مالک ہے، سول کوڈ کو ترجیح دینا کوئی دانشمندی کی بات ہو سکتی
ہے؟۔

محمد علی خان جو شتوئیس کیلائی
موضع حسین پور (چاندی کوٹ)